افکارِ صوفیہ

کتاب و سنت کی روشنی میں

مؤلفہ

الشیخ عبد الرحمٰن عبد الخالق حفظہ اللہ

ترجمہ

محمد صادق خلیل

الناشر

حبیب الرحمٰن جاوید منیجر ضیاء السنۃ ادارہ الترجمہ والتالیف

رحمت آباد۔ فیصل آباد (الباکستان)

اشاعت .... اوّل

تعداد .... ایک ہزار

قیمت .... ۱۵ روپے

ناشر .... ناظم ضیاء السنۃ ادارۃ الترجمہ والتالیف فیصل آباد

ملنے کا پتہ

مکتبہ ضیاء السنۃ ادارۃ الترجمہ والتالیف رحمت آباد، فیصل آباد

طبع فی المطبعۃ العربیۃ

۳۰- لیک روڈ، بالمقابل منشی چیمبر، پرانی انارکلی، لاہور- پاکستان

فہرست مضامین

افتتاحیہ

یہ بات کس قدر بدیہی ہے کہ انسان خدا کا غلام اور اس کا مملوک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو تمام مخلوق پر برتری اور فوقیت دی ہے لیکن انسان تمام بلندیوں، عظمتوں، خوبیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجز سر فگندہ ہے کوئی انسان تقویٰ پرہیزگاری میں خواہ کتنے اونچے مقام پر فائز کیوں نہ اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ ترنگ میں آکر اپنے رب ہونے کا دعویٰ کرے فرعون نے انا ربکم الاعلیٰ کا نعرہ لگایا تو وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ نہ سکا پس اگر کوئی صوفی اپنے مقام سے غافل ہو کر انا الحق کا نعرہ لگاتا ہے جیسا کہ مشہور صوفی منصور حلاج نے لگایا یا بعض نے کہا ما فی جبتی الا اللہ بعض نے کہا سبحانی سبحانی ما اعظم شانی بعض نے کہا بطشی اشد من بطش اللہ بعض نے کہا رجل علی عنق کل ولی تو وہ اسلام کی تعلیمات کے خلاف سرگرم عمل ہے۔ اس لحاظ سے اگر ہم تصوّف ازم کو اسلام کے منافی سمجھتے ہیں جیسا کہ اشتراکیت، اشتمالیت، نیچریت، نازی ازم ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو بھی ہم اسلام کے خلاف سمجھتے ہیں تو ہم حق بجانب ہیں۔ اکبر الہ آبادی مرحوم کیا خوب کہہ گئے ہیں ع

> کہا منصور نے خدا ہوں میں ڈارون بولا بوزنہ ہوں میں بوذرمہ
> ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

اسلام کی پہلی تین صدیوں میں تصوف کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ کتاب وسنّت میں تو اس کا ذکر تک نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ لفظ تصوف میں تزکیہ نفس کا ادعا ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے تزکیۂ نفس کے ادعا سے منع فرمایا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے (فلا تزکوا انفسکم هو اعلم بمن اتقیٰ) (پس تم اپنا تزکیہ نہ بیان کرو وہ خوب جانتا ہے کون

پرہیز گار ہے)

پس نفس امارہ کو مغلوب کرنے کے لیے وہ علاج اختیار کیا جائے جو کتاب و سنت میں موجود ہے۔ رہبانیت کے انداز پر اپنے آپ کو مختلف قسم کی اذیتوں میں مبتلا کرنا رات بھر نہ سونا بیاہ شادی سے دُور رہنا لذیذ ماکولات مشروبات سے پرہیز کرنا جنگلوں میں زندگی گزارنا غسل نہ کرنا طہارت کا خیال نہ رکھنا حجامت نہ بنوانا ستر نہ ڈھانپنا شرائع اسلام کے قریب نہ جانا۔ نائے ہو کے نعروں سے محفل گرم رکھنا اسلام کے ظاہر احکام کا مذاق اڑانا علماء پر پھبتیاں کسنا۔ ہاتھوں پاؤں میں کڑے پہننا سر پہ لبودی رکھنا وغیرہ حرکتوں کا نام تصوف ہے۔ ان تمام باتوں کا ذکر صوفیہ کی مشہور مستند کتابوں مثلاً اللمع فی التصوف، الفتح الربانی والفیض الروحانی، منشورات الصوفیہ، الفصوص اخبار الحلاج تا الطبقات للسلمی، الطواسین، التعرف علی مذہب التصوف، رسائل ابن عربی، فتوحات مکیہ میں موجود ہے۔ نیز مولانا مودودی مرحوم نے بھی تفسیر تفہیم القرآن جلد خاص از صـ۳۲۴ـ تا صـ۳۳۳ـ پر رہبانیت کی تاریخ کے عنوان کے تحت بھی ان میں سے بعض چیزوں کا ذکر کیا ہے۔

خیال رہے کہ تصوّف رہبانیت میں مکمل یگانگت ہے۔ تصوف کی تاریخ بہت پُرانی ہے یہ دراصل یونانی افکار کا مجموعہ ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

مکدر کرد مغرب چشمہ ہائے علم و عرفاں را
جہاں را تیرہ تر سازد چہ شائی چہ اشراقی

خیال رہے تصوف ایسی مہلک بیماری ہے جس نے اُمتِ مسلمہ میں افتراق کی خلیج کو وسیع کیا۔ اس کی ترویج و اشاعت سے بدعات کو فروغ حاصل ہوا۔ تاریخ شاہد ہے کہ صوفیہ کی جانب سے ہر دور میں توحید و سنت کے روشن چہرے کو مسخ کرنے کی بھرپور کوششیں کی گئیں۔ اباحیت کے دروازوں کو کھولا گیا۔ چنانچہ تصوف کے حلقوں میں اس شعر کو کتنی شدت حاصل ہے۔

بمے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید   کہ سالک بے خبر نہ بود۔ زراہ و رسم منزل ہا

تصوّف کو خوش نما خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا۔ اس طرح سادہ لوح عوام کو فریب میں مبتلا رکھا گیا۔ اس کی قباحتوں کو نظر سے اوجھل رکھنے کے لیے اس کا نام زہد عبادت ذکر و فکر طریقت رکھا گیا۔ حالانکہ الحاد زندقہ وحدت الوجود جیسے مشرکانہ نظریات کے پھیلنے کا سبب تصوف ہی ہے۔ آئندہ کتاب میں صوفیہ پر لکھی گئی مستند کتابوں کے حوالہ جات سے ثابت کیا جائے گا۔ کہ ان کی وجہ سے اسلامی معاشرہ میں کس قدر نا قابل علاج بیماریوں نے جنم لیا۔ یہاں تک کہ اللہ پاک کی ذات پر رکیک حملے کیے گئے فرعون کو مومن ثابت کیا گیا اور ابلیس کو موحد کہا گیا ان تمام باتوں کے حوالہ جات اسی کتاب میں موجود ہیں چنانچہ ان کا ذکر آئندہ اوراق میں ہو رہا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت جنید بغدادیؒ اور ان کے ہم مشرب بزرگانِ دین صالح قسم کے تصوّف پر فائز تھے جسے اسلامی شریعت میں زہد کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انہوں نے بھی اصلاحی کوششیں کیں۔ وہ کتاب و سنت کی راہنمائی آگے بڑھتے رہے وہ برابر صراطِ مستقیم پر گامزن رہے۔ لیکن اب تو تصوف کے پردے میں غیر اسلامی افکار کو فروغ ہو رہا ہے۔ ہندوانہ رسم و رواج کو اختیار کیا جا رہا ہے خانقاہوں میں عرس کے موقع پر صوفیاء مشائخ کی موجودگی میں رقص و سرود، قوالی کی محفلیں جمتی ہیں مرد و زن کا بے محابا اختلاط رہتا ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

تمدّن تصوف شریعت کلام بتان عجم کے پجاری تمام
حقیقت روایات میں کھو گئی یہ امت خرافات میں کھو گئی

بخدا! ایسے مناظر پر بے اختیار آنکھوں سے آنسو امڈ آتے ہیں۔ اور زبان سے یہ کلمات نکلتے ہیں۔ اے اللہ! تیرے دین کی قدروں کو پامال کیا جا رہا ہے۔ شرک و بدعت کا بازار گرم ہے۔ امر بالمعروف نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والے علماء زہاد مساجد و مدارس سے سر بکف ہو کر کیوں نہیں نکلتے۔ اور توحید کے پرچم کو ہاتھ میں لے کر میدان میں کیوں نہیں اترتے۔ خدا سے باغی مخلوق کو خدا کے قریب لانے کیلئے

کیوں کوششیں نہیں کرتے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ دین اسلام میں تحریفات، تلبیسات، تاویلات کا ارتکاب کرتے ہوئے اس کی شکل کو بگاڑا جارہا ہے۔ اہلِ سنت علماء کس لیے چادریں اوڑھ کر سوئے ہوئے ہیں۔ وہ کب تک صرف اصول فقہ اور فلسفہ کی گتھیوں کو سلجھانے میں مصروف رہیں گے۔ کیا ان کی آنکھیں بند ہوچکی ہیں۔ کیا ان کے کانوں میں مشرکانہ نعروں کی آوازیں نہیں آرہی ہیں۔ وہ خوابِ غفلت سے بیدار کیوں نہیں ہوتے ہیں۔

اسلام کے خلاف محاذ آرائی موجود ہے۔ کھلے بندوں شعائر اللہ کی توہین ہورہی ہے۔ کتاب و سنت کا استخفاف ہورہا ہے۔ غیر اللہ کی پرستش ہورہی ہے۔ نام نہاد ملحد صوفیہ سے محبت اور عداوت کے تعویزات حاصل کیے جارہے ہیں۔ تصوف کے پسِ پردہ علم کہانت، علم نجوم کو فروغ حاصل ہورہا ہے۔ سادہ لوح عوام کو شعبدہ بازیاں دکھلاکر انہیں اپنا گرویدہ بنایا جارہا ہے۔ عوام ان کے پاؤں چوم رہے ہیں۔ انہیں خدائی کے مقام پر بٹھایا ہوا ہے۔ وہ بھی آنکھیں پھیرتے ہوئے اپنے خدا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور خود کو یہ مشکل کشا سمجھتے ہیں۔ اگر اس قسم کے مشرکانہ واقعات پر بھی آپ کی دینی حمیت جوش میں نہیں آتی ہے۔ تو پھر کہنا چاہیے کہ اب زمانہ کو ایسے پاکباز مجاہد اسلام کا درد رکھنے والے موحدین انقلابی انسانوں کی ضرورت ہے جو اللہ پاک کی توحید قائم کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانیاں دینے کے لیے تیار ہوں۔ جو دل و جان سے اسلام کے سچے خادم ہوں۔ جنہوں نے اسلام میں داخل ہونے کے بعد موت پر بیعت کر رکھی ہو۔ وہ میدان میں اتریں گے۔ اور ان لوگوں کو جنہوں نے بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ اور بد باطن اسلام کے شجرۂ طیبہ کو بیخ و بن سے اکھاڑنے میں مصروف ہیں۔ بدعات کو فروغ دے رہے ہیں۔ ہائے ہُو کی دھنوں میں منہمک ہیں۔ دین اسلام کے اصولوں کے ساتھ استہزاء کررہے ہیں۔ انہیں اسلام کش حرکتوں سے باز رکھیں گے۔ اور اسلام کو بالکل اسی خوبصورت انداز میں پیش کریں گے جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا تھا۔

افکار صوفیا کتاب و سنت کی روشنی میں

الفکر الصوفی فی ضوء الکتاب والسنۃ کا اردو ترجمہ ہے۔ جس کو فضیلۃ الشیخ عبدالرحمن عبدالخالق

حفظہ اللہ نے تالیف فرمایا۔ وہ کویت میں فاضل مشہور سلفی علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق وہاں کے مشہور ادارہ الدار السلفیہ کے ساتھ ہے۔ جس کے رئیس معالی الشیخ عبد اللہ خلف السبت ہیں۔ اس ادارہ کی جانب سے عام طور پر توحید و سنت کے تحفظ کے سلسلہ میں رسائل شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ارباب ادارہ نشر و اشاعت کے میدان میں پورے خلوص کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔ وہ برابر اس کوشش میں ہیں کہ اسلام کا تابناک چہرہ بدعات خرافات سے مسخ نہ ہونے پائے۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اس میں مؤلف حفظہ اللہ نے نہایت عرق ریزی محنت جانفشانی کے ساتھ صوفیہ کے حالات پر مرتب شدہ مستند کتابوں سے نہایت احتیاط کے ساتھ حوالہ جات فراہم کیے ہیں۔ مقصد صرف یہ ہے۔ کہ عوام الناس کو خبردار کیا جائے کہ اصل راہنمائی کتاب و سنت سے حاصل کی جائے۔ ان سے روگردانی کرتے ہوئے دیگر لوگوں سے راہنمائی حاصل کرنا اگرچہ وہ طہارت تقویٰ کے لحاظ سے بظاہر کتنے ہی اونچے مقام پر کیوں نہ ہوں۔ تب بھی ان سے غلطی کا امکان ہے۔ باقاعدہ ان کے افکار کو کتاب و سنت پر پیش کر کے ان کی تردید کی گئی ہے۔ اس نیک جذبہ کے پیش نظر یہ کتاب تحریر کی گئی۔ اور اسی ہی جذبہ کے پیش نظر اردو دان حضرات کے لیے اس کو اردو زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ آج سے پانچ سال قبل جب انہوں نے میری جانب کچھ کتابیں اور رسائل ارسال فرمائے تو ان کا اصرار تھا۔ کہ الفکر الصوفی کا اردو ترجمہ کیا جائے۔ گوناگوں مصروفیتوں کی وجہ سے یہ کام معرض التواء میں پڑا رہا۔ اور ترجمہ کی تکمیل کے بعد بھی دو سال تک اس کی طباعت کی جانب توجہ نہ کر سکا اب حالات نے کچھ ساتھ دیا۔ تو اللہ پاک کے فضل و کرم سے کتاب آپ کے سامنے ہے۔ جن احباب و رفقاء نے کتاب کے سلسلہ میں میرے ساتھ تعاون کیا ہے میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور اللہ پاک سے دعا کرتا ہوں کہ تبلیغی میدان میں اس حقیر خدمت کو بھی وہی قبولیت حاصل ہو جو اس سے پہلے دیگر کتابوں کو حاصل ہے۔ و لیس ذلك على الله العزيز و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

محمد صادق خلیل: مدیر ضیاء السنۃ ادارہ الترجمۃ والتالیف رحمت آباد

فیصل آباد۔

جمعۃ المبارک ۱۰ رجب المرجب ۱۴۰۲ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ان الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضلل فلا ھادی لہ واشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ ــــ اما بعد

اُمت محمدیہ پر اللہ تعالےٰ کا احسان ہے کہ خود اس نے دینِ اسلام کی حفاظت کی ذمّہ داری اُٹھائی۔ امت محمدیہ پر یہ بوجھ نہ رکھا۔ پس اللہ کی جانب سے نازل کردہ دین محفوظ ہے۔ یہاں تک کہ قیامت کے قریب کتاب وسُنّت کا عِلم سینوں اور کتابوں سے اٹھا لیا جائے گا۔ پس دینِ اسلام کمی وبیشی سے محفوظ ہے۔ اللہ پاک نے اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا انا نحن نزلنا الذکر وانا لہٗ لحٰفظون اللہ کے دشمنوں نے اسلام کو مٹانے اور اس سے لوگوں کو باز رکھنے کی کوششیں کیں لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ پھر انہوں نے مکر وفریب اور گوناگوں حیلوں بہانوں سے لوگوں کو دینِ اسلام کی تعلیمات سے بے بہرہ رکھنے اور انہیں صراطِ مستقیم سے منحرف کرنے کے لیے پورا زور لگایا اور بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھ کر کمین گاہوں سے نکل کر دین حق پر ناروا حملے کیے۔ لیکن ان کی تمام کوششیں اکارت گئیں۔

تصوف اسلام کے خلاف سازش ہے

اسلام کے دشمنوں نے اپنی اغراض مشئومہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے نہایت خطرناک سازشیں تیار کیں۔ ان کی انتہائی خطرناک سازش یہ تھی۔ کہ انہوں نے تصوف اور متصوفین کے دام تزویر کو خوب صورت لباس میں پیش کیا۔ اس طرح وہ لوگوں کو بہکانے کا انوکھا جال لے کر میدان میں اترے۔ خیال رہے۔ کہ تصوف کا نظریہ قدیم نظریہ ہے۔ اور یہ نظریہ آہستہ آہستہ اُمّت محمدیہ میں پھیلتا چلا گیا۔ اس لیے ضرورت محسوس کی گئی۔ کہ تصوف کی اصل حقیقت کو اجاگر کیا جائے۔ اور اس کے اصول و فروغ کو کتاب و سنّت پر پیش کیا جائے۔ تاکہ اسلام کے روشن اور تابناک چہرے کو اس قسم کی ملمع سازیوں بہتان طرازیوں اور بدنما داغ دھبّوں سے پاک صاف رکھا جائے۔

چنانچہ استاذی المکرم شیخ عبدالرحمٰن عبدالخالق اس اہم کام کے لیے میدانِ عمل میں اترے اور انہوں نے تصوف کے موضوع کو زیرِ بحث لاتے وقت جہاں تصوف کی حقیقت کو واضح کیا۔ وہاں یہ بھی بتایا۔ کہ اس کی نشوونما کب ہوئی۔ اور کن لوگوں نے اس کو پروان چڑھایا نیز تصوف اور دیگر فتنوں میں کونسا رشتہ ہے۔ اور تصوف کا اسلام کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ مؤلف نے تصوف کی حقیقت کو اجاگر کرتے ہوئے متصوفین کے اقوال اور ان کی مساعی کو بیان کیا۔ اور ثقہ حوالہ جات سے ثابت کیا۔ کہ صوفیا کس قسم کے نظریات کے حامل تھے۔ الحمدللہ جناب مؤلف صاحب اپنی کوشش میں کامیاب ہیں۔ اور ہم جب ان کی علمی کوشش سے ناظرین کو آگاہ کر رہے ہیں۔ تو ہم مسرّت محسوس کر رہے ہیں۔ کہ ہم مسلمانوں کے

عقائد و اعمال کو صحیح سمت پر لانے کے لیے جو تگ و دو کر رہے ہیں۔ ہم اس میں کامیاب ہیں۔ پس ہمارا مقصد یہ ہے۔ کہ مسلمان اسلامی تعلیمات سے روشناس ہوں۔ اور اس کی اتباع کریں۔ اور غیر اسلامی تعلیمات سے کنارہ کش رہیں۔ ہم ہر قسم کی علمی تنقید جو خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ کی جائے گی۔ اس پر بہت خوشی محسوس کریں گے۔ واللہ نسأل الھدایۃ والتوفیق وھو مولانا رب العالمین

الناشر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ

الحمد للہ الذی وصف نفسہ فی کتابہ وعلی السنۃ رسلہ فھدانا و علمنا وشرح صدور اھل الایمان الی توحیدہ وعبادتہ وتقدیسہ فشھد واشھادۃ الحق ان اللہ الہ واحد سبحانہ کما قال عزوجل شھد اللہ انہ لا الٰہ الا ھو والملائکۃ والوالعلم قائماً بالقسط لا الٰہ الا ھو العزیز الحکیم[1]

احمدہٗ سبحانہٗ واستعینہ واستغفرہ واسأله ان یجعلنی احد اولٰئک الناس شھد والہ بالواحدنیۃ واصلی واسلم علٰی عبدہ ورسولہ محمد الداعی الٰی سبیل ربہ علٰی بصیرۃ الذی وصف ربہ بما اوحی الیہ فاقام للناس دینھم الحق فصلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلٰی الہٖ واصحٰبہ ومن سار علٰی نھجہ القویم الٰی یوم الدین وبعد -

---

[1] آل عمران (۱۸)

تصوّف کیا ہے

تصوف ایک تحریک ہے۔ اور اس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ دوسری صدی ہجری کے نصف میں اس کا آغاز ہوتا ہے۔ اور صرف ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں تحریک عقائد و فنون میں آخری سرحدوں تک جا پہنچتی ہے۔ گویا کہ تیسری صدی کے آخر میں اسے کمال حاصل ہوتا ہے۔ اور عام مسلمانوں کا دین اور عقیدہ تصوف اور اس کی ایجاد کردہ اصطلاحات کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ یہاں تک کہ نویں دسویں گیارہویں صدی ہجری میں عالم اسلام جہالت و گمراہی کے عمیق گڑھے کی نذر ہو چکا تھا۔ فرانسیسی فاتحین کے مسلسل حملوں نے ان کے اعصاب کو اس قدر مختل کر دیا تھا۔ کہ وہ ان کے حملوں کا نوٹس لینے کی بجائے جوابًا بخاری شریف کے ختم سے ان کا دفاع کر رہے تھے۔ چنانچہ قاہرہ کی مشہور علمی درس گاہ جامعہ ازھر میں علماء نے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا۔ کہ دشمنوں کے حملوں کا جواب اوراد و وظائف وغیرہ سے دیا جائے اسی طرح نابلیون کا انتخاب کر کے اسے صوفیاء کی گودڑی پہنائی گئی۔ اور اس کی راہنمائی میں ذکر و فکر کی مجالس کا انعقاد کیا گیا۔ البتہ گیارہویں صدی ہجری کے بعد جب مسلمان فاتحین نے یورپ کی سرزمین میں وہاں کے لوگوں سے جنگیں کیں تو حالات کچھ بہتر ہوتے چلے گئے۔ صوفیاء نے غیر مسلموں کی معاونت کی۔

مغرب میں شیخ احمد تیجانی کے متبعین نے فرانسیسیوں کے قدموں کو افریقہ کے شمال اور مغرب میں مضبوط کیا۔ سوڈان میں سید میر غنی اور طریقہ ختیمہ کی متصوفانہ تحریک نے انگریزوں کے عمل دخل کے اسباب کو تقویت بخشی۔ نتیجتًا سوڈان میں مہدی تحریک کا خاتمہ ہو گیا۔ گویا کہ تصوف کی تحریک نے ہر دور میں اسلام کو نقصان

پہنچایا۔ اور آج بھی یہ تحریک پورے شباب پر نظر آرہی ہے۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ نہ صرف اسلامی ممالک میں بلکہ یورپین ممالک میں بھی اس کے عظیم الشان تعلیمی مراکز موجود ہیں۔ اور تصوف کی تحریک پورے زور وشور کے ساتھ چل رہی ہے۔ صوفیاء کے افکار فاسدہ کے متعلق مسلسل یہ پروپگینڈہ ہورہا ہے۔ کہ اس سے نہ صرف یہ کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہو رہی ہے۔ بلکہ یہ دین اسلام کے احیاء کا ایک ذریعہ ہے۔ اس طرح تصوف پر اسلام کا لیبل لگا کر پیش کیا جارہا ہے۔

کچھ اپنے متعلق

راقم الحروف اس تحریک کے ساتھ عرصہ دراز سے وابستہ ہے۔ اور اس کی تعلیمات وغیرہ سے پوری واقفیت ہے۔ اس پر تالیف کردہ کتب اور ان کے مؤلفین کا جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوا۔ کہ اگر ایک طرف بعض محققین علماء نے ان کو زندیق ملحد قرار دیا ہے۔ تو دوسری طرف بعض دوسرے دانشوروں نے ان کی پاک بازی پر قصائد لکھے ہیں اور انہیں قطب غوث کے مقام پر بٹھا دیا ہے۔ جب میں نے ان کے بارے میں اہل علم کے موقف کو مختلف دیکھا۔ تو میں نے عزم کیا۔ کہ پورے غور وفکر نقد وجرح کے ساتھ ان کے تشخص کو متعین کیا جائے۔ اور تحریک تصوف کے مد وجزر کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس کا واضح تصور پیش کیا جائے۔ تاکہ حق و باطل میں امتیاز ہو جائے۔

چنانچہ میں نے اس کی تنقیح توضیح میں امکانی مساعی سے گریز نہیں کیا۔ اور زندگی کا معتد بہ حصّہ متصوفین کے اقوال جمع کرنے اور مشکل عبارتوں کو سمجھنے اور ایک کے قول کی دوسرے کے قول کے ساتھ تشریح کرنے میں گزارا۔ یہاں تک کہ اللہ کے فضل وکرم سے میں نے تصوف کے دجل وفریب اور اس کی تلبیسانہ حرکتوں کو

بھانپ لیا۔ اور اس کی سیہ کاریوں ہلاکت آفرینیوں سے پوری طرح باخبر ہو گیا۔ لیکن ان تمام حقائق کو سمجھنا کچھ آسان نہ تھا۔ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ کہ میں نے اس سلسلہ میں کس قدر اذیتیں برداشت کیں۔ اور روحانی طور پر کن خطرناک دشوار گذار راستوں سے مجھے گذرنا پڑا۔ اس لیے کہ متصوفین نے بظاہر کتاب اللہ اور سُنّت رسول اللہ کی اطاعت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اور اس قدر غلط تشریحات و تاویلات کا دروازہ کھول دیا تھا۔ کہ اسلام کا تاب ناک اور روشن چہرہ ان کے باطل نظریات کی وجہ سے غبار آلود ہو چکا تھا۔ سُنّت صحیحہ کے مفہوم کو ان کی من مانی تاویلات نے بالکل بدل کر رکھ دیا تھا۔ یہاں تک کہ انکی فسوں کاریوں اور عیارانہ حرکات کو سمجھنا مشکل ہو گیا تھا۔ اور مسلمانوں کے لیے صوفیاء کے افکار دخیلہ جس قدر تباہی و بربادی کا منظر پیش کر رہے تھے۔ شائد اس قدر کسی دوسرے فتنے سے خطرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ پس صوفیاء کے افکار نے اسلامی عقائد کو مسخ کر دیا۔ اور جب کسی قوم وملّت کے عقائد میں اختلاط واقع ہو جائے۔ تو اس سے بڑھ کر ان کے لیے کوئی خطرناک چیز نہیں ہے۔ اس لیے کہ اعمال دراصل عقائد کے تابع ہوتے ہیں۔ اور عقائد میں تبدیلی رونما ہونے سے اعمال میں تبدیلی کا آنا ناگزیر ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جب تاتاریوں کے عقائد صحیح ہو گئے۔ اور صحیح معنی میں مسلمان ہوئے۔ تو انہوں نے مسلمانوں سے لڑائیاں کرنی بند کر دیں مسلمانوں نے جب اسلام چھوڑ دیا۔ اور اس کے عقائد کو خیر باد کہہ دیا۔ تو انہوں نے جہاد سے بے رغبتی کا اظہار کیا نتیجتہً وہ استعمار کے ماتحت زندگی گزارنے پر قانع ہو گئے۔ اور انہوں نے ان کی ثقافت، کلچر کو اپنانے میں کچھ حرج محسوس نہ کیا۔

پس اس کتاب میں متصوفین کے عقائد اور ان کے مقاصد کو ان کی کتابوں کے حوالہ جات سے بیان کیا گیا ہے خصوصاً وہ کتابیں جو صوفیاء کے ہاں مشہور اور قابلِ اعتماد ہیں۔ مثلاً اللمع کلا بازی کی التعرف علی مذہب اہل التصوف، سلمی کی طبقات الصوفیہ۔ ایسی مشہور کتابیں جن کے مؤلفین کو متصوفین میں شمار کیا جاتا ہے۔ نیز اس کتاب میں تصوف کے عقائد اور کتاب و سنّت کے عقائد میں جو واضح فرق پایا جاتا ہے۔ اس کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

کتاب ہذا کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔ کہ تصوف دراصل فلسفہ کی پیداوار ہے۔ چنانچہ اسلام سے قبل افلاطون اور اس کے رفقاء فلسفیوں اور ہندوستان کے فلاسفرز نے اس کی سرپرستی کی۔ اور اس کی اشاعت میں سرگرمی سے حصّہ لیا۔ اسی لیے تو ہم کہتے ہیں۔ کہ ہندوستان کے باشندے قدیم زمانہ سے لے کر آج تک تصوف کے دلدادہ رہے ہیں۔ اور اس کے بنیادی عقائد وحدت الوجود وغیرہ کے پرچار میں کوشاں رہے ہیں۔ اور پھر ایران جو کہ ہندوستان کا پڑوسی ملک ہے۔ اس میں بھی اسلام سے قبل سے لے کر اب تک فارسی شعراء کے کلام میں وحدت الوجود کے نظریہ کو دلکش، دلفریب انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ آپ مولانا جلال الدین رومی کے اشعار میں کثرت کے ساتھ اس کا ذکر پائیں گے۔

زہد اور تصوّف میں فرق

زہد اسلامی عقیدہ ہے۔ اور تصوف کا اسلام کے ساتھ کچھ تعلق نہیں۔ ان دونوں میں نمایاں فرق ہے۔ بلکہ وہ زہد جس کا ذکر کتاب و سُنّت میں موجود ہے۔ اس زہد کے خلاف ہے۔ جس کا ذکر عقائد صوفیاء میں ہے۔

تصوّف کی حقیقت

تصوف دراصل فلسفہ ہی کی ایک شکل ہے۔ اور ایسے عقیدے کا نام ہے۔ جس سے امورِ غیبیہ کا دل پر کشف ہوتا ہے

اس کا تعلق حضراتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسّلام کی تعلیمات سے بالکل نہیں ہے۔
اس سلسلہ میں صوفیاء کا نقطہ نظر یہ ہے۔ کہ ہم براہ راست اللہ سے یا براہ راست اللہ کے رسول سے بصورت کشف علوم حاصل کرتے ہیں۔ اور ہم اس حقیقت کو چھپانا گناہ سمجھتے ہیں۔ کہ کائنات میں صرف اللہ کا وجود ہے۔ اس لحاظ سے ہر انسان خدا ہے۔ اور خدا انسان ہے۔ بلکہ حقیقت میں تمام ایک ہیں۔ البتہ صورتوں کے لحاظ سے فرق ہے۔ وہ برملا اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ غیبی علم کے حصول کے لیے کشف ہی ایک راستہ ہے۔ جس میں مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ مجاہدہ کی بے شمار صورتیں ہیں۔ جو بلحاظ وقت، جگہ، اشخاص کے تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ البتہ نفس کو اذیتوں سے ہمکنار رکھنا، معینہ اوراد و وظائف کا بار بار کرنا لوگوں سے اختلاط نہ کرنا بالکل الگ تھلگ رہنا اور پاکیزگی کا خیال نہ کرنا لازمی امور ہیں۔ البتہ اتنی بات ذہن نشین کر لیجئے۔ ضروری نہیں کہ جو انسان تصوف کی طرف منسوب ہے۔ اس کا عقیدہ بعینہٖ وہی ہے، جس کا ہم نے ذکر کیا۔ ہاں وہ شخص جو تصوف کے آخری مرحلہ پر پہنچ چکا ہے۔ اس کا عقیدہ واقعی یہی ہوتا ہے۔ اور جو صوفی ابھی تصوف کے مراحل طے کر رہا ہے اور آخری مرحلہ تک رسائی حاصل نہیں کر سکا ہے۔ تو وہ جہاں تک پہنچا ہے۔ اسے بس اتنی ہی خبر ہے۔ وہ آخری مراحل سے بے خبر ہے اگر وہ ہمارے بیان کردہ عقیدے کا انکار کر رہا ہے۔ تو ہم اسے معذور سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ ابھی وہ اس مقام سے ناآشنا ہے۔ جہاں صوفی کی آخری منزل ہے اسی طرح تصوف کو زیرِ بحث لاتے وقت اس کے جملہ پہلوؤں سے نقاب کشائی کرنا ایک وسیع موضوع

ہے۔ اس مختصر کتاب میں اس سے عہدہ برآ ہونا بہت مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ
میں نے بحث کو صرف صوفیاء کے عقائد پر مرکوز رکھا ہے۔ اور اس اہم سوال کا جواب
دینے کی پوری کوشش کی ہے۔ کہ تصوف کیا چیز ہے۔ اور اس کا مال کس عقیدے کو
جنم دیتا ہے۔ نیز کتاب و سُنّت میں اس کا کیا مقام ہے۔ پس میں اللہ پاک سے درخواست
کرتا ہوں۔ کہ وہ مجھے اس پر بحث کرنے نیز صوفیاء کے افکار نے عبادات سلوک تزکیہ نفس
میں جن پیچیدگیوں کو جنم دیا ہے۔ ان سے نمٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس کے ساتھ ساتھ میں چاہتا ہوں۔ کہ صوفیا کے افکار نے سیاسیات، اجتماعیات
پر جو غلط اثرات چھوڑے ہیں۔ ان کی نشان دہی کروں۔ اور پھر صوفیاء کے مختصر حالات
بیان کروں۔ اس محنت کدو کاوش سے مقصود صرف یہ ہے۔ کہ اللہ پاک کی مشیئت ایزدی
سے یہ کتاب امت مسلمہ کے لیے ہدایت اور روشنی کا مینار ثابت ہو۔ اور وہ پر پیچ
راہوں اور وادیوں سے نکل کر صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائے۔ اور شیطانوں کی دعوت
قبول کرنے سے انکار کرے۔ نیز میں بارگاہ خداوندی میں ملتجی ہوں۔ کہ میرا یہ کام خالصتاً
لوجہ اللہ ہو۔

عبدالرحمٰن عبدالخالق یوسف
الکویت فی غرۃ جمادی الاخرہ ۱۳۹۷ ہجری
۲۱ جون ۱۹۷۷ء

پہلا باب

اسلامی عقائد و اعمال کا سرچشمہ کتاب و سنّت ہے

بعثتِ رسول کے وقت اہلِ عرب کی حالت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت اگرچہ اہلِ عرب اللہ کے وجود کو تسلیم کرتے تھے۔ اور اسے ہی کائنات کا خالق سمجھتے تھے۔ لیکن وہ اللہ پاک میں یہ قدرت تسلیم نہیں کرتے تھے۔ کہ وہ مرے ہوئے لوگوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ اسی لیے وہ قیامت کے منکر تھے۔ ان کے نزدیک کائنات کی تخلیق کا مقصد سوائے تخلیق کے اور کچھ نہ تھا۔ وہ اللہ کو بادشاہوں کے مثل سمجھتے تھے۔ لہذا حصول رزق، دشمنوں پر فتح یابی اور بارش کے حصول کے لیے اس کے مقربین فرشتوں۔ نیک لوگوں کو بطور وسیلہ اس کی بارگاہ میں پیش کرتے تھے۔

عیسائیوں کی حالت

عیسائیوں کا الہامی دین مٹ چکا تھا۔ صرف معدودے چند افراد ایسے دکھائی دیتے تھے۔ جو عیسائیت پر قائم تھے۔ وگرنہ اکثریت کا عموماً یہ نظریہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ خود خدا ہیں۔ یا خدا کے بیٹے ہیں۔ وہ علماء اور صوفیا کو بھی خدا سمجھتے تھے۔ جبکہ وہ ان کے اقوال پر عمل کرنے کو ضروری گردانتے تھے۔ اگرچہ وہ صراحتاً نصوصِ کتاب کے خلاف کیوں نہ ہوں۔ اور نیک لوگوں کو اس قدر مقدّس سمجھتے۔ کہ انہیں خدائی کے مقام پر بٹھایا ہوا تھا۔

یہودیوں کی حالت وہ اللہ کو مخلوق کے مثل سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ جن قبیح باتوں مثلاً (کذب بخل وغیرہ) کی نسبت مخلوق کی طرف کی جاتی تھی۔ وہ ان کی نسبت اللہ کی طرف کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اور وہ خدا کو مستقبل کے علم سے بے خبر اور غافل سمجھتے تھے۔

فلاسفہ کی حالت ایران وہندوستان منطق اور فلسفہ کا گہوارہ تھا۔ جہاں ہر فلسفی اپنا الگ نظریہ رکھتا تھا۔ اور اپنے خیال کے مطابق اپنے معبود کی بہترین تصویر کشی کر کے اپنے دل ودماغ کو تسکین دے رہا تھا۔ بعض فلاسفہ نے دو خداؤں کے تصوّر کا پرچار کر رکھا تھا۔ کہ عالم کے دو خدا ہیں۔ ایک روشنی والا ہے۔ دوسرا اندھیرے والا ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان مقابلہ ہوتا رہتا ہے لیکن روشنی والے خدا کی جانب لوگوں کو دعوت دی جا رہی تھی۔ اور اس کی حمایت میں آتش دانوں میں آگ جلتی رہتی تاکہ روشنی کے خدا کو اندھیرے کے خدا پر غلبہ حاصل رہے۔

بعض نے کائنات کے خالق خدا کا اقرار کیا۔ اور انسان کو پابند بنایا۔ کہ وہ اپنے نفس کو ہر قسم کے مجاہدات کر کے فنا کر دے۔ اور خالق کائنات کے ساتھ مل جائے۔ اس کے فنا ہونے کے بعد دوبارہ اس کی روح اس جہاں کی جانب واپس نہیں آسکتی۔

بعض نے ذات واحد کے وجود کو کلی قرار دیا۔ کہ بلحاظ صفات کے اس کے وجود متعدد ہیں۔ چنانچہ ایرانی شعراء اور نثر نگاروں کے کلام میں کثرت کے ساتھ ذات واحد کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔ کہ وہ ذات تو ہر چیز میں دکھائی دے رہی ہے۔ اور ہر وجود میں اس کا ظہور ہے۔ یونان کے فلاسفہ نے کائنات کے خالق کو واجب الوجود علتہ العلل قرار دیا۔ یعنی تمام عالم کی نشأت کا وہ مصدر ہے لیکن کائنات کی

تخلیق کی حکمت کے بارے میں کسی مقصود پر نہ پہنچ سکے۔ اس کو واضح کرتے میں جس قدر انہوں نے کوششیں کیں۔ اسی قدر تحیر، عجز نے ان کے قدموں کو چلنے سے روک دیا۔ اور وہ نہ تو انسان کی تخلیق کی غرض و غایت معلوم کر سکے۔ اور نہ ہی اس کی انتہا سے انہیں آگاہی ہو سکی۔

اگرچہ فلاسفہ نے اس عالم سے ماوراء مشاہدات و مناظر معلوم کرنے کے لیے اپنی قوتِ عقلیہ کو استعمال کیا۔ اور اس سلسلہ میں ان کی مساعی کا جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ غیب کی ان باتوں سے پردہ کشائی نہ کر سکے۔ اور بالآخر انہوں نے اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ کہ کوئی انسان عقل کے بل بوتے پر ظن، تخمین یا زیادہ سے زیادہ حدس کے حدود سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یا پھر اس کے معلومات کا دائرہ کار جنوں شیطانوں کے دائرہ کار سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔

بعثتِ رسول کا مقصد آپ کی بعثت کا مقصد یہ ہے۔ کہ آپ بھولے بھٹکے گمراہ لوگوں کو ان کے پروردگار اور خالق کی طرف مائل کریں۔ اور انہیں بتائیں کہ کس غرض کے لیے اللہ پاک نے انہیں پیدا کیا۔ اور ان کی آخری منزل کہاں ہے۔ اور کون سا راستہ اللہ کو محبوب ہے۔ اور وہ کن کاموں سے راضی ہوتا ہے۔

چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خبردار کیا۔ کہ میں اللہ پاک کی جانب سے تمہاری راہنمائی کے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اور میرے پاس اللہ کی جانب سے وحی آتی ہے۔ جو اللہ پاک کا کلام ہے۔ مجھے حکم ہے کہ میں تم کو اس سے آگاہ کروں۔ اور اگر تم مجھے سچا نہیں مانتے ہو۔ تو پھر اس کے کلام کی ایک سورت کے مثل سورت لاؤ۔ آپ نے نہ صرف یہ کہ انہیں چیلنج کیا بلکہ ان کے عقائد، مذاہب، افکار وغیرہ کو باطل

قرار دیا۔ اور ان کے بطلان پر دلائل پیش کیے۔ اسطرح آپ نے دعوت و ارشاد کے کام کو فعال و موثر بنانے میں ان کے عقائد کو فاسد قرار دیا۔ اور مقابلہ کے لیے ہمہ وقت تیار رہے۔ اس طرح آپ کے اور مخالفین کے درمیان عقائد کے میدان میں خوب خوب معرکہ آرائی رہی۔ اور یہ جنگ دو بنیادی باتوں پر مرکوز رہی۔ پہلی بات یہ تھی کہ اللہ پاک خالق کائنات ہے۔ وہی عبادت کے لائق ہے۔ اس کی صفات، افعال میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اور وہ تمام صفاتِ کمالیہ۔ جلالیہ جمالیہ کے ساتھ موصوف ہے۔ اور ہر قسم کے نقص عجز سے پاک ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ اس کی معرفت صرف اسی راستہ پر چل کر ہو سکتی ہے۔ جو راستہ خود اس نے مشروع فرمایا۔ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ زندگی کے تمام شعبوں میں فقط اس کی راہنمائی کافی ہے۔ چنانچہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ سے بھی یہی مطلوب ہے۔ کہ اللہ کا تقرب حاصل کرنے کیلئے آپ کی اطاعت ضروری ہے۔ پس ثابت ہوا کہ پہلی بنیادی بات یہ ہے کہ صرف اللہ کو معبود سمجھا جائے۔ اور دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مطاع مانا جائے۔

مشرکین عرب کا آپ کے ساتھ مجادلہ

جب آپ نے ان بنیادی باتوں کا پرچار شروع کیا تو مشرکین عرب نے کہا۔ کیا اب اتنے خداؤں کی جگہ صرف ایک خدا کافی ہو سکتا ہے۔ یہ بات بڑی عجیب ہے۔ اور اپنے خداؤں کے ساتھ عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے۔ کہ ہم تو اس لیے ان کی عبادت کرتے ہیں۔ تاکہ وہ ہمیں اس کے زیادہ قریب کر دیں۔ اور ہماری سفارش کریں۔ آپ نے جواباً فرمایا۔ اگر زمین و آسمان میں ایک خدا نہ ہوتا۔ بقول تمہارے زیادہ خدا ہوتے۔ تو یہ نظام درہم برہم ہو جاتا۔ اور تمہارا ان خداؤں سے

شفارش کرانا بھی غلط ہے۔ یاد رکھو کہ شفاعت کا حق اللہ پاک کے پاس ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش نہیں کر سکتا۔ مشرکین عرب نے اللہ کے حکم کے بغیر جن چیزوں کو حلال وحرام وغیرہ بنا رکھا تھا۔ آپ نے انہیں سرزنش کرتے ہوئے فرمایا۔ تم نے دین میں اللہ کی اجازت کے بغیر جن چیزوں کو مشروع قرار دیا ہے۔ ان سے باز آجاؤ۔ کسی چیز کو حرام وحلال بنانے کا حق صرف اللہ پاک کو ہے۔ اور میں اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں۔ پس اللہ کے حکم سے میں جن چیزوں کو تمہارے لیے حلال کروں۔ وہ حلال ہیں۔ اور جن کو حرام کروں وہ حرام ہیں۔ اور صرف ان راستوں پر چل کر ہی تم اللہ پاک کا قرب حاصل کر سکتے ہو۔

یہودیوں اور عیسائیوں کا مجادلہ

ان دونوں فریقوں نے اپنے آپ کو حق پر قرار دیا۔ اور دوسروں کو باطل پر قرار دیا۔ اور یہ کہ جنت صرف ان کے لیے خاص ہے۔ آپ نے انہیں جواب دیا۔ کہ ہدایت تو من جانب اللہ ہوتی ہے۔ وہ کسی فریق کے ساتھ تو خاص نہیں۔ ہاں میں اللہ کا رسول ہوں۔ جو میری اتباع کریں گے۔ وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ اگر تم لوگ میری اطاعت نہیں کرو گے۔ تو تم بھی اسی طرح ہدایت سے محروم رہو گے جس طرح مشرکین عرب محروم ہیں۔ قرآن پاک میں ان تینوں گروہوں کے مجادلات اور آپ کی طرف سے ان کے جوابات مذکور ہیں۔

صحابہ کرام

اگر ایک طرف ان تینوں گروہوں نے آپ کے ساتھ مخالفت کا بازار گرم رکھا اور آپ پر ناروا حملے کیے تو دوسری طرف کچھ ایسے خوش قسمت لوگ بھی نظر آتے ہیں جنہوں نے آپ

کی دعوت پر لبیک کہی ایمان کی دولت سے مالا مال ہوئے اخلاص للہیت کے جذبہ سے سرشار ہوکر آپ پر جاں نثاری کیلئے تیار ہو گئے آپ کی محبت میں اس قدر مخلص دکھائی دیتے ہیں کہ آپ کے اشاروں پر وہ جان کی بازی لگانے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔ آپ کی اطاعت و فرماں برداری سے سرموانحراف کے تصور سے لرزہ براندام ہو جاتے ہیں اور آپ کی دعوت کو آگے پھیلانے میں بھرپور جدوجہد کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ نیز اللہ کی تقدیس و کبریائی کے ذکر میں اور اس کی عبادت میں ان کا انہماک قابلِ رشک دکھائی دیتا ہے۔

وہ اس عہد و پیمان کو جس کے پورا کرنے کا انہوں نے آپ سے عہد کیا تھا وہ اس سے جس عمدگی اور متانت سے عہدہ برآ ہوتے ہیں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ پاک نے ان کی تعریف میں متعدد آیات نازل فرمائیں۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

محمد رسول اللہ والذین معہ اشدآء علی الکفار رحمآء بینھم تراھم رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود (الفتح: ۲۹)	محمد اللہ کا رسول اور اس کے رفقاء کافروں پر سخت گیر اور آپس میں رحیم ہیں۔ اے دیکھنے والے تو ان کو دیکھتا ہے کہ خدا کے آگے جھکے ہوئے سربسجدہ ہیں۔ وہ اللہ کا فضل اور اس کی دل جوئی کرتے ہیں ان کے چہروں پر سجدہ کے نشان ان کی علامت ہیں۔

نیز ان کے بہترین کارناموں پر ان کی تعریف میں آپ نے فرمایا۔

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم	بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے پھر وہ لوگ جو ان کے بعد ہیں۔ پھر وہ لوگ جو ان کے بعد ہیں۔

بلکہ کچھ صحابہ کے بارے میں خاص طور پر آپ نے جنت کی بشارت دی، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر سے کہا۔

وزنت بالامة فرجحت ووزن ابوبکر بالامة لست فیها فرجح ووزن عمر بالامة لست فیها وابوبکر فرجح [۲]	میرا امت کے ساتھ وزن ہوا میں بھاری رہا ابوبکر کا اُمت کے ساتھ وزن ہوا (میں اس میں نہ تھا) ابوبکر بھاری رہا۔ عمر کا امت کے ساتھ وزن ہوا (میں اور ابوبکر اس میں نہیں تھے) تو عمر بھاری رہا

اسی مضمون کی حدیث مسند احمد (۵/۴۴۔ ۵۰) ابوداؤد (۴۶۳۴) ترمذی تحفہ (۹۳۸۹) میں صحیح سند کے ساتھ موجود ہے حضرت ابوبکرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک صحابی نے خواب میں دیکھا کہ ترازو آسمان سے نازل ہوا اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اور ابوبکر کا وزن کیا گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھاری نکلے اور ابوبکر، عمر کا وزن کیا گیا تو ابوبکر بھاری نکلے پھر عمر اور عثمان کا وزن کیا گیا تو عمر بھاری نکلے۔ پھر ترازو اٹھالیا گیا۔ اس حدیث کو علامہ البانی نے حاشیہ مشکوٰۃ المصابیح (۳/ ۲۳۳) دو سند کے ساتھ قوی ثابت کیا ہے۔

---

[۱] بخاری، مسلم عن ابن مسعودؓ [۲] مسند احمد (۲/ ۷۶) اس کی سند کمزور ہے سند میں عبداللہ بن مروان راوی ایسا ہے جس کو ابن ابی حاتم نے (الجرح والتعدیل ۵/ ۳۳۴) میں ذکر کیا لیکن جرح، تعدیل کا ذکر نہیں کیا البتہ ابن حبان نے اس کا ذکر ثقات میں کیا ہے۔ نیز اس سند میں ابوعائشہ راوی کا ذکر بھی ابن ابی حاتم نے (الجرح والتعدیل ۹/ ۴۱۷) میں کیا لیکن جرح تعدیل کا ذکر نہیں کیا اس لحاظ سے یہ دونوں راوی مجہول ہیں ان کے علاوہ باقی روات ثقہ ہیں۔

ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا

لو کان بعدی نبی لکان عمر[1]	اگر میرے بعد کوئی نبی آنا ہوتا تو عمرؓ ہوتے۔

اور حضرت بلالؓ کی تعریف میں آپؐ نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

انی سمعت دف نعلیك بین یدی فی الجنة[2]	میں نے جنت میں اپنے آگے تیرے جوتوں کی آہٹ سُنی۔

اس قسم کی حدیثیں جن میں صحابہ کرام کے فضائل کا ذکر ہے کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔

---

[1] مسند احمد (۴/۱۵۴) ترمذی (۲/۲۹۳) ترمذی نے حسن کہا حاکم نے صحیح کہا (۳/۸۵) ان تمام نے اس کو عقبہ بن عامر سے مرفوع روایت کیا نیز علامہ البانی نے سلسلہ صحیحہ (۳۲۷) میں اس کو حسن کہا ہے جامع سلیم (۵۱۶۰)

[2] بخاری (۳/۲۷۶) من الفتح احمد (۲/۳۳۳-۴۳۹ عن ابی ہریرۃ) بخاری کے الفاظ یوں ہیں۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لبلال عند صلوٰۃ الفجر یا بلال حدثنی بارجی عمل عملتہ فی الاسلام فانی سمعت دف نعلیك بین یدی فی الجنة قال ما عملت عملا ارجی عندی انی لم اتطھر طھورا فی ساعة لیل او نھار الا صلیت بذلك الطھور ما کتب لی ان اصلی	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بلالؓ سے فجر کی نماز کے وقت سوال کیا اے بلالؓ مجھے اپنا وہ عمل بتائیں جس سے آپ اسلام میں بہت زیادہ پُر امید ہیں اس لیے کہ میں نے جنت میں اپنے سامنے تیرے جوتوں کی آہٹ سنی ہے اس نے جواب دیا میں نے اس سے زیادہ پُر امید عمل کوئی نہیں کیا کہ میں رات دن کی جس گھڑی میں وضو کرتا تو اس کے بعد جس قدر مقدر میں ہوتا نفل پڑھتا۔

اللہ کی عبادت اور رسول اکرم کی اطاعت دونوں ضروری ہیں

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر یہ پیغام مسلسل پہنچاتے رہے کہ نجات اخروی کے لیے صرف ایک اللہ کی عبادت اور میری اطاعت ضروری ہیں یہ دونوں اسلام کا سرچشمہ ہیں اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اقرار کرنے کا بھی یہی تقاضا ہے یہی وجہ ہے کہ آپ ان دونوں کے خلاف کسی شخص سے خواہ وہ آپ کا کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ تھا ایک لفظ بھی سننے کے لیے تیار نہ تھے چند دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

پہلی دلیل انہ رأی یوماً بید عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ورقۃ من التوراۃ وکان عمر قد اعجبہ ما فیہا نغضب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غضباً شدیداً وقال لعمر اھذا وانا بین اظھرکم لقد جئتکم بھا بیضاء نقیۃ واللہ لو کان موسٰی حیاً لما وسعہ الا ان یتبعنی[1]

آپ نے ایک دن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تورات کا ایک ورق دیکھا عمر کو اس ورق پر مندرج مضمون سے شغف ہو رہا تھا آپ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا عمر! میں ابھی تم میں موجود ہوں کہ تم نے یہ انداز اختیار کر لیا ہے (یاد رکھو) میں تمہارے پاس جس شریعت کو لایا ہوں وہ روشن واضح ہے بخدا اگر موسٰی بھی زندہ ہوں تو ان کو بھی میری اتباع کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو۔

---

[1] مسند احمد (۳/ ۳۸۷) بیہقی شعب الایمان - دارمی (۱/ ۱۱۵-۱۱۶) زیادہ الفاظ ہیں حضرت الاستاذ علامہ البانی (تخریج المشکاۃ ۱/ ۶۳) میں رقمطراز ہیں کہ اس کی سند میں مجالد بن سعید کمزور راوی ہے چونکہ حدیث لالکائی ھروی اور دیگر محدثین کے نزدیک طرق کثیرہ کے ساتھ مروی ہے اس لیے حسن ہے۔ میں نے بعض طرق کو (ارواء الغلیل ۱۵۸۹) میں ذکر کیا ہے۔

چند امور مستنبطہ

اولاً: اس حدیث سے ثابت ہو گیا کہ آپ کو کس قدر تعجب لاحق ہوا جب آپ نے دیکھا کہ کتاب و سُنّت کے غیر سے راہنمائی حاصل کی جا رہی ہے اور آپ یہ دیکھ کر سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ کتاب و سُنّت پر ایمان لانے کا مطلب تو یہ ہے کہ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ ہدایت صرف ان دونوں میں منحصر ہے نہ کہ اس سے روگردانی کی جائے۔

ثانیاً: آپ نے واضح، روشن دین پیش فرمایا جو ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک صاف ہے اس میں تحریف اور تبدیلی کا امکان نہیں پھر صحابہ کرام دین اسلام کی تعلیمات سے اس قدر سرشار تھے کہ وہ ان کی موجودگی میں ایسی کتابوں کو کیسے قابلِ اعتناء قرار دے سکتے تھے جن میں تغیر، تبدل، کمی بیشی کی کوئی ضمانت نہیں دی گئی تھی۔

ثالثاً: حضرت موسیٰ علیہ السلام جن پر تورات نازل ہوئی تھی بالفرض اگر وہ آپ کے عہد میں زندہ ہوتے تو ان کے لیے بھی آپ کی اطاعت ضروری تھی اور اپنی شریعت کو چھوڑنا ضروری تھا جس کی وہ زندگی بھر تبلیغ کرتے رہے پس یہ دعویٰ ثابت ہو گیا کہ کتاب و سنت کی موجودگی میں کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ ان کو چھوڑ کر کسی دوسری منزل من اللہ کتاب اور شریعت پر عمل پیرا ہو اس طرح نہ اسے اللہ کا قرب حاصل ہو گا اور نہ ہی خود اس کے اپنے نفس کی اصلاح ہو گی جب وہ کتاب و سنّت کو چھوڑ کر کسی دوسرے پیغمبر کی لائی ہوئی کتاب پر عمل پیرا ہو گا۔

دوسری دلیل

ارشاد نبوی ہے:

ان رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم سمع خطیبا یخطب بین یدیہ فکان مما

بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک خطیب سے سُنا جو آپ کے سامنے خطبہ کہہ رہا تھا اس نے خطبہ میں جب یہ

قال من يطع الله ورسوله فقد رشد ومن يعصهما فقد غوىٰ فقال له رسول الله صلی الله علیه وسلم بئس خطيب القوم انت قل ومن يعص الله ورسوله فقد غوىٰ۔

کہا کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ رشد والا ہے اور جو ان دونوں کی نافرمانی کرے گا وہ گمراہ ہے تو آپ نے فرمایا تو قوم کا برا خطیب ہے (تجھے اللہ اور اس کے رسول کو الگ الگ ذکر کر کے) کہنا چاہیے تھا کہ جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ گمراہ ہے۔

اس حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام لوگوں کے سامنے خطیب کو ٹوکا اس لیے کہ اس نے اللہ اور اس کے رسول کو ایک ضمیر میں جمع کر دیا۔ اس سے سامعین کا اس وہم میں مبتلا ہونا ناممکن نہیں تھا کہ وہ دونوں ایک مرتبہ میں ہیں اور آپ کو ہرگز ہرگز یہ گوارا نہ تھا کہ کوئی شخص اس غلط نظریہ کا حامل ہو۔ آپ اللہ کی توحید کے مقام کو محفوظ کرنے کے لیے اس کو لرزش کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ کیوں اس نے اللہ اور اس کے رسول کے درمیان فرق نہیں کیا جب کہ شریعت محمدیہ میں ضروری ہے کہ ان باتوں میں جو اللہ کے لیے واجب ہیں اور جو اس کے رسول کے لیے واجب ہیں فرق کیا جائے۔

تیسری دلیل فتح الباری (۳/۳۵۸-۶/۲۲۳-۲۲۴-۸/۲۴۶-۶/۴۹-۶۹) مسند احمد (۱۶/۴۳۶) میں مذکور ہے کہ عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ

۱؎ مسلم شرح نووی (۶/۱۵۹) مسند احمد ۴ (۲۵۶-۳۷۹)

(جن کا شمار خیار صحابہ میں ہوتا ہے) جب فوت ہوئے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
بھی وہاں تشریف لائے آپ نے ایک جلیل القدر صحابیہ ام العلاء سے سنا وہ کہہ رہی
تھی اے ابو السائب! میں تیرے بارے میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ نے تیری عزت
کی ہے آپ نے اس کی بات کا رد کیا اور فرمایا تجھے کیسے معلوم ہوا کہ اللہ نے
اس کو عزت عطا کی ہے ان الفاظ کے ساتھ آپ نے ڈانٹ پلائی کہ کیوں اس نے
غیب کی حالت کو یقین کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا ہے اس لیے کہ غیب کی باتوں
کو اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں جانتا اس نے آپ کے فرمان کا جواب دیتے ہوئے کہا
یا رسول اللہ! تعجب ہے اگر اللہ نے اس کی عزت نہیں کی تو کس کی عزت کرے گا
اس کا جواب اگرچہ فصاحت و بلاغت کا نمونہ تھا لیکن آپ نے اس کے باوجود
اس کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرمایا بخدا میں اللہ کا رسول ہوں اس
کے باوجود میں نہیں جانتا کہ کل قیامت کے دن میرے ساتھ کیا سلوک ہوگا خیال
کیجئے آپ نے ایسا مسکت جواب دیا کہ اس کے بعد کسی دوسرے جواب کی ضرورت
ہی محسوس نہیں کی جاتی کس قدر اللہ وحدہ کی ذات کی عظمت اور اس کے جلال کا
اعتراف ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی عظیم شخصیت اللہ وحدہ کی جناب
میں خوفزدہ ہیں اس کے حکم کے منتظر ہیں اور اس کے عذاب سے خائف اور اس
کی رحمت کے امیدوار ہیں حضرت ام العلاء نے جب آپ کی زبان سے یہ الفاظ سنے
تو وہ اصل حقیقت معلوم کر گئیں اور اللہ کی عظمت اس کے دل و دماغ پر اس قدر
حاوی ہو گئی کہ وہ فوراً پکار اٹھی کہ اس کے بعد اب میں کسی انسان کے تزکیہ کو جزم
کے صیغہ کے ساتھ ذکر نہیں کروں گی کتاب و سنت میں کثرت کے ساتھ ایسی

آیات اور احادیث موجود ہیں جن سے اس نظریہ کو تقویت حاصل ہو رہی ہے کہ یقین کے ساتھ کسی کا تزکیہ کرنا جائز نہیں ہے ارشاد خداوندی ہے:

الم تر الی الذین یزکون انفسھم بل اللہ یزکی من یشاء ولا یظلمون فتیلا۔ انظر کیف یفترون علی اللہ الکذب وکفی بہ اثما مبینا[1]

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا۔ جو اپنے تئیں پاکیزہ کہتے ہیں، بلکہ خدا ہی جس کو چاہتا ہے۔ پاکیزہ کرتا ہے۔ اور ان پر دھاگے برابر بھی ظلم نہیں ہوگا۔ دیکھو یہ خدا پر کیسا جھوٹ (طوفان) باندھتے ہیں۔ اور یہی گناہ صریح کافی ہے۔

نیز فرمایا۔ لیس بامانیکم ولا امانی اھل الکتاب من یعمل سوءا یجز بہ ولا یجد لہ من دون اللہ ولیا ولا نصیرا۔[2]

نجات نہ تو تمہاری آرزوؤں پر ہے۔ اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر جو شخص بُرے عمل کرے گا۔ اسے اسی طرح کا بدلہ دیا جائے گا۔ اور وہ خدا کے سوا نہ کسی کو حمایتی پائے گا۔ اور نہ مددگار۔

ان دونوں آیتوں کا مفہوم یہودیوں کے اس نظریہ کو بے بنیاد قرار دے رہا ہے کہ ہم جنتی ہیں اور ہم اللہ کے مقرب ہیں اسی طرح عیسائی جو مدعی تھے کہ ہم جنتی ہیں اس لیے کہ ہم اللہ کے بیٹے حضرت عیسیٰ کے متبعین میں سے ہیں جس نے ان کو گناہوں سے پاک صاف کر دیا اور وہ مسلمان جو فخریہ انداز میں کہتے پھرتے ہیں کہ ہم تو آخر الزمان خاتم النبیین پیغمبر کے امتی ہیں ہمارے جنتی ہونے میں کچھ شبہ نہیں اللہ پاک نے ان سب کے دعوؤں کو غلط قرار دیا اور کہا کہ جنت کا مستحق صرف

---

[1] النساء ۴۹-۵۰) [2] النساء ۱۲۳)

وہ انسان ہے جو نیک عمل کرتا ہے اور جو شخص بداعمال ہے اس کو اس کی بداعمالیوں کا بدلہ ملے گا کسی پیغمبر کی جانب منسوب ہونے سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوگا لہذا کسی کی آرزو کے مطابق فیصلہ نہیں ہوگا بلکہ ایک حدیث مروی ہے۔

من قال انا فی الجنۃ فھو فی النار — جس شخص نے کہا میں جنتی ہوں وہ دوزخی ہے۔[1]

چوتھی دلیل

حدیث میں ہے۔

ان رجلاً جاء الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال لہ ما شاء اللہ وشئت فقال لہ صلی اللہ علیہ وسلم اجعلتنی للہ نداً قل ما شاء اللہ وحدہ[2]

ایک آدمی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ سے مخاطب ہو کر کہا جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں آپ نے اس کا رد کرتے ہوئے فرمایا تو نے تو مجھے اللہ کا شریک بنا دیا صرف اتنا کہو جو ایک اللہ چاہتا ہے۔

---

[1] یہ حدیث ضعیف ہے حافظ سخاوی نے اس کو المقاصد الحسنۃ ص ۴۲۳ میں ذکر کیا دوسری حدیث کے ضمن میں ذکر کیا ہے اس کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں (من قال انا مؤمن فھو کافر ومن قال انا عالم فھو جاھل) (جس شخص نے خود کو مومن کہا وہ کافر ہے اور جس نے خود کو عالم کہا وہ جاہل ہے) حافظ سخاوی نے اس حدیث کو معجم الصغیر طبرانی کے حوالہ سے ذکر کیا اور اس کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے۔ یہی حدیث مسند دیلمی میں جابر سے سخت کمزور سند کے ساتھ مروی ہے نیز اس حدیث کو حارث بن ابی اسامہ نے عمر سے موقوف روایت کیا ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ منقطع بھی ہے۔

[2] احمد ۱/۲۱۴، ۲۲۴، ۲۸۳، ۳۴۷ البخاری الادب المفرد (۷۸۳) حضرت الاستاذ علامہ البانی نے سلسلہ صحیحہ (۱۳۸) میں اس کو ذکر کیا اور اس کی تخریج بیان کی اور حدیث کو حسن قرار دیا۔

جھوٹ ثابت ہوتی ہیں [۱]

ابن صیاد کاہن کا ذکر

ابن صیاد مدینۃ الرسول میں رہائش پذیر تھا صحابہ کرام اسے دجال سمجھتے تھے ایک دفعہ رسول اکرم صحابہ کرام کی جماعت کے ساتھ اس کے گھر گئے آپ نے اس کا امتحان کرنے کی غرض سے اس سے دریافت کیا کہ میں نے اپنے دل میں کچھ چھپایا ہے بتا وہ کیا ہے (آپ نے اپنے دل میں سورۂ دخان کو چھپایا تھا) یہودی اللہ کے دشمن نے جواب دیا تم نے درخ دھواں چھپایا ہے یعنی مکمل کلمہ نہ بتا سکا ادھورا کلمہ ذکر کر دیا آپ نے اس کا جواب سن کر فرمایا ذلیل ہو جا کبھی تیرا مرتبہ بلند نہیں ہوگا۔ یعنی تو کاہن رہے گا تیرا تعلق شیاطین کے ساتھ رہے گا۔

اسی لیے آپ نے اس سے دریافت کیا تجھے کیا دکھائی دیتا ہے۔ اس نے جواب دیا میرے پاس کبھی سچا اور کبھی جھوٹا آتا ہے یعنی جو خبریں شیاطین اس کے پاس لاتے ہیں کبھی وہ سچ ہوتی ہیں اور کبھی جھوٹ ہوتی ہیں اس پر آپ نے فرمایا تیرا معاملہ تجھ پر خلط ملط ہو گیا ہے [۲]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شیطان کے لیے کسی مومن کے دل میں پوشیدہ بات پر اطلاع پا لینا بھی ممکن ہے پھر وہ اپنے متعلقہ انسان کاہن کو اس کی خبر دے

---

[۱] مسلم نووی ۱۸/۲۲۵) بخاری میں متعدد مقامات میں مذکور ہے حافظ ابن کثیر نے اس حدیث کو ابو داؤد ترمذی ابن ماجہ کی طرف منسوب کیا ہے مسند احمد میں بھی مروی ہے۔

[۲] بخاری میں طویل روایت ہے ۳/۲۶۲، ۶/۱۲، ۱۲/۱۸ من الفتح مسلم ۱۸/۴۶، ۵۸ نووی۔

دیتا ہے لیکن ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم کسی غیب کی بات کی تصدیق نہ کریں ہاں جو غیب کی باتیں اللہ اور رسول کی طرف سے ہم تک پہنچیں ان پر ایمان لانا اور ان کی تصدیق ضروری ہے۔

جن دلائل کا ہم نے ذکر کیا ہے ان کے علاوہ بھی بے شمار دلائل موجود ہیں جن سے ہمارے عقائد کو استحکام حاصل ہوتا ہے اور ہمارے اس ایمان میں اضافہ ہوتا ہے کہ غیب کی باتوں کا اصل منبع کتاب اللہ ہے اللہ پاک نے جن غیب کی باتوں سے ہمیں خبردار کیا ان پر ایمان لایا جائے اور جو غیب کی باتیں معلوم نہیں ہیں ان کے معلوم کرنے کے لیے کاھنوں وغیرہ کے پاس جانا کفر ہے۔ اعاذنا اللہ من ذٰلک

اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا جائز نہیں یاد رکھیں یہ عبادت غیر شرعی ہے اور خواہ مخواہ عبادات میں تکلّفات کو داخل کر کے عبادات کی اصل شکل کو بگاڑنا ہے اور جادۂ حق سے انحراف ہے ۔

تیسری دلیل ۔ حدیث میں ہے

عن عبد الله بن عمرو بن العاص ان اباه شكاه الى الرسول صلى الله عليه وسلم بانه زوجه امرأة من اشراف العرب و مكث يسألها فما شاء ذالك لخمس عشرة ليلة فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم لعبد الله ابن عمرو ابن العاص بلغني انك تصوم النهار وتقوم الليل فقال نعم يارسول الله ثم قال له الرسول صلى الله عليه وسلم صم من كل شهر ثلثة ايام فقال يارسول الله قال خمسا قال يارسول الله قال سبعا قال يارسول الله قال تسعا ثم قال له فى النهاية صم صيام اخى داؤد كان يصوم يوما ويفطر يوما ولا يفر اذا لاقى [۱]

مكث يسألها كل يوم كيف رأيت زوجك فقالت صالح غير انه لم يطألنا فراشا وذالك لخمس عشرة

عبداللہ بن عمرو بن عاص سے روایت ہے کہ اس کا باپ اس کی شکایت لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا کہ اس نے اپنے بیٹے کا نکاح عرب کی نہایت شریف خاندان کی عورت سے کیا اور وہ روزانہ لڑکی سے دریافت کرتا ہے کہ تیرے خاوند کا برتاؤ تیرے ساتھ کیسا ہے وہ جواب دیتی ہے کہ وہ نیک انسان ہے لیکن اس نے ابھی تک ہمارے بستر پر پاؤں نہیں رکھا یہ کیفیت پندرہ دن سے اسی طرح ہے آپ نے عبداللہ بن عمرو بن عاص سے دریافت کیا مجھے تیرے متعلق یہ خبر ملی ہے کہ تو دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات کو قیام کرتا ہے اس نے اثبات میں جواب دیا آپ نے فرمایا تجھے ہر مہینے میں تین روزہ رکھنا ہے اس نے زیادہ کی درخواست کی آپ نے فرمایا پانچ اس نے مزید عرض کیا آپ نے فرمایا سات اس نے مزید اجازت طلب کی آپ نے فرمایا نو آخر میں آپ نے فرمایا تم میرے بھائی حضرت

داؤد علیہ السلام والے روزے رکھو وہ ایک دن روزہ رکھتے ایک دن افطار کرتے اور دشمن سے لڑائی میں بھاگتے نہیں تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام راہ اعتدال کو اچھا جانتا ہے اگر انسان ایک جانب اللہ کے حقوق ادا کرتا ہے تو دوسری جانب حقوق العباد کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے خاص طور پر اپنے نفس، بیوی وغیرہ کے حقوق کو بھی فراموش نہ کرے صحیح حدیث میں ہے۔

ان لربك عليك حقا ولزوجك عليك حقا فاعط كل ذي حق حقه [۲]

بے شک تیرے رب کا تجھ پر حق ہے تیری بیوی کا تجھ پر حق ہے لہٰذا ہر حقدار کے حق کو پورا کرو۔

پہلی حدیث جس کو ہم نے تیسری دلیل کے عنوان سے ذکر کیا ہے اس میں ایک جملہ ایسا ہے جس پر ہم آپ کو گہرے غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں اور وہ حدیث کا آخری جملہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت داؤدؑ میدانِ جنگ سے بھاگتے نہیں تھے معلوم ہوا راہ اعتدال کو چھوڑ کر زیادہ روزے رکھنا درست نہیں تاکہ کہیں قوت میں کمزوری نہ آ جائے اور میدان جہاد میں شجاعت و مردانگی کے جوہر دکھانے کی بجائے میدان سے بھاگ نہ آئے ظاہر ہے کہ اسلام میں خاص طور پر اس بات کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ جہاد کی طاقت سے محرومیت نہ ہو دیکھئے اگر حضرت داؤدؑ ایک طرف کثرت کے ساتھ روزے رکھتے ہیں تو دوسری طرف اس کے باوجود ان میں اتنی طاقت موجود رہتی ہے کہ وہ

---

[۱] یہ حدیث دو حدیثوں سے مرکب ہے جن کو امام مسلم نے روایت کیا ۸/۴۴-۴۷ نووی) البخاری نحوہ ۵/۱۲۴ الفتح) [۲] البخاری ۵/۱۱۴ الفتح)

میدانِ جنگ سے بھاگتے نہیں ہیں۔

لیکن اگر آپ راہ اعتدال چھوڑ دیتے ہیں اور اتنی کثرت سے روزے رکھتے ہیں یا عبادت میں غلو اختیار کرتے ہیں تو کہیں اس کے اثرات یہ نہ نکلیں کہ آپ کی طاقت کمزور ہو جائے اور جہاد جیسی عظیم سعادت سے محروم ہو جائیں اور آپ کا نام نافرمانوں کی فہرست میں درج ہو جائے لہذا افراط سے دور رہیں اور اعتدال کی راہ اختیار کریں۔

چوتھی دلیل - حدیث میں ہے ان رجلاً سأل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن صومہ فغضب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غضباً شدیداً فجلس عمر بن الخطاب یقول رضینا باللہ رباً وبالاسلام دیناً حتی سکن غضب النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔[1]

ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے روزہ کے بارے میں سوال کیا آپ اس پر سخت ناراض ہوئے حضرت عمر بیٹھ گئے اور یہ کلمات کہے کہ ہم اس پر راضی ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے اور اسلام ہمارا دین ہے یہاں تک کہ آپ کا غصہ جاتا رہا۔

آپ اس لیے ناراض ہوئے کہ سوال کرنے والا آپ کے افعال کی (اس مخصوص عبادت میں جو آپ کے ساتھ خاص ہے) مشابہت کرنا چاہتا ہے جب کہ آپ دو دن بلکہ تین دن بلا کھانے پینے کے روزہ سے ہوتے اور فرماتے کہ مجھے تو میرا رب کھلاتا پلاتا ہے لہذا تم میں کون میرے جیسا ہے کہ وہ اس خصوصیت میں میرے ساتھ شریک ہو اور میری مشابہت کرے یعنی آپ صحابہ کرام کو عبادات میں زیادہ تکلیف و اذیت میں ڈالنے سے روک رہے ہیں۔

---

[1] مسلم ۱/۴۹-۵۱)

پانچویں دلیل

تین شخص ازواج مطہرات کے حجروں کی طرف آئے انہوں نے آپ کی عبادت کے بارے میں دریافت کیا انہیں اس سے آگاہ کر دیا گیا لیکن شائد انہوں نے آپ کی عبادت کو معمولی سمجھا اس لیے ان میں سے ایک نے کہا ہمارا اللہ کے رسول کے مقابلہ میں کیا مقام ہے آپ کے تو تمام گناہ معاف کر دیئے گئے ہیں اس لیے آپ کو زیادہ عبادت کرنے کی ضرورت نہیں، ایک نے کہا میں رات بھر قیام کروں گا نیند نہیں کروں گا۔ دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزہ سے رہوں گا کبھی افطار نہیں کروں گا تیسرے نے کہا میں نکاح نہیں کروں گا جب آپ گھر تشریف لائے تو آپ کو اس واقعہ سے مطلع کیا گیا تو آپ نے لوگوں کو جمع کیا منبر پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا کیا حال ہے ان لوگوں کا جنہوں نے اس قسم کی باتیں کی ہیں خبردار میں تم سب سے زیادہ اللہ کے بارے میں زیادہ علم رکھنے والا ہوں اور سب سے زیادہ متقی ہوں اور میرا حال یہ ہے کہ میں روزہ رکھ بھی لیتا ہوں چھوڑ بھی دیتا ہوں رات کو قیام بھی کرتا ہوں اور نیند بھی کرتا ہوں اور میں نے کئی عورتوں سے نکاح کیا ہوا ہے۔

پس جو شخص میرے طریقہ میں سے اعراض کرے گا وہ میرے دین پر نہیں ہے[1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عبادات کو مشروع راہ کو چھوڑ کر غیر مشروع راہ اختیار کرنا اسلام سے نکلتا ہے اگرچہ نیت میں کچھ فتور نہ ہو اور مقصود بھی اللہ کی رضا ہو اس لیے کہ اللہ کی عبادت اور اس کی خوشنودی غیر مشروع میں ممکن ہی نہیں۔

---

[1] بخاری، مسلم لیکن ان کی روایت میں آپ کے منبر پر تشریف رکھنے اور لوگوں کو جمع کرنے کا ذکر نہیں ہے۔

پس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت سے تجاوز کرنا اور عبادت میں غلو اختیار کرنا اگر ایک لحاظ سے رہبانیت ہے اور شریعت کے احکام میں اپنی طرف سے اضافہ ہے تو دوسری طرف یہ بدعت بھی ہے اور پھر غور کیجئے کہ مذکورہ حدیث میں تین انسانوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں گستاخانہ انداز اختیار کیا جب کہ آپ کی عبادت کو معمولی سمجھا گویا کہ وہ آپ پر اتہام لگا رہے ہیں کہ آپ اللہ کی معرفت میں اونچے مقام پر نہیں تھے اور نہ آپ نے اس کا خاص خیال رکھا اور اس پر دلیل یہ پیش کی کہ آپ کے تو تمام گناہ معاف کر دیئے گئے ہیں لہذا آپ کو تو عبادت میں اتنی شدت کی ضرورت نہ تھی ظاہر ہے کہ آپ کے بارے میں اس قسم کے نظریات رکھنا آپ کی شان کے خلاف ہے حالانکہ آپ نے زندگی بھر اللہ کی عبادت میں کوئی دقیقہ فرگذاشت نہیں کیا اور قرآن پاک میں آپ کو پہلا مسلمان قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

قل ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین لا شریک لہ وبذلک امرت وانا اول المسلمین [۱]	کہہ دو۔ کہ میری نماز اور میری عبادت اور جینا اور میرا مرنا سب خدائے رب العالمین ہی کیلئے ہے۔ جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی بات کا حکم ملا ہے۔ اور میں سب سے اوّل فرمانبردار ہوں۔

تو کیا کسی مسلمان کے لیے جائز ہے کہ وہ آپ کے بارے میں اس قسم کے نظریات کا اظہار کرے جب کہ آپ نے اپنے متعلق واشگاف الفاظ میں فرمایا کہ میں تم سب سے زیادہ علم والا ہوں تم سب سے زیادہ پرہیز گار ہوں لہذا میرا

---

[۱] الانعام ۱۶۲-۱۶۳)

طریقہ اختیار کرنا ضروری ہے اور جو شخص میرا طریقہ اختیار نہیں کرے گا وہ اسلام سے نکل جائے گا۔ پھر آپ ہر خطبہ میں فرمایا کرتے تھے۔

وشر الامور محدثاتها وکل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة وکل ضلالة فی النار [1]

بدترین کام وہ ہیں جو دین میں داخل کیے گئے ہیں اور ہر نیا کام جو ثواب کی نیت سے دین میں داخل کیا جاتا ہے وہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر قسم کی گمراہی جہنم کا مستحق بنانے والی ہے۔

پس تعبدی کام وہ ہیں جو مشروع ہیں اور غیر مشروع کام بدعت ہیں ان سے اللہ کا تقرب حاصل نہیں ہو سکتا نیز حدیث وارد ہے۔

من احدث فی امرنا هذا مالیس منه فهو رد [2]

جو شخص ہمارے اس دین میں ایسی چیز داخل کرے گا جو اس میں نہیں اس کو مردود سمجھا جائے گا۔

اہل کتاب کی مخالفت کا حکم دینا

شریعت محمدیہ چونکہ مستقل شریعت ہے اس میں زندگی کے تمام شعبوں کے متعلق راہ نمائی موجود ہے لہذا نہ صرف عبادات اخلاق وغیرہ میں کسی دوسرے فرقہ کی مشابہت سے احتراز کیا جائے۔ بلکہ لباس تک میں اہل کتاب کی مخالفت کا حکم دیا ہے تاکہ دوسری امتوں کے اخلاق، افعال، معاملات، لباس، عبادات وغیرہ کا اسلام کے اصولوں کے ساتھ اختلاط نہ ہو جائے اس ضابطہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

---

[1] مسلم، بیہقی، نسائی روایت کے جملہ طرق معلوم کرنے کے لیے حضرت استاذی المکرم علامہ البانی حفظہ اللہ کے رسالہ خطبۃ الحاجۃ کا مطالعہ کریں۔ [2] بخاری، مسلم)

مثال

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (باوجود اس علم کے کہ نماز جوتے اتار کر پڑھنا خشوع خضوع کے عین مطابق ہے) جوتے پہن کر نماز ادا کرنے کا حکم دیا آپ کے اس حکم میں محض یہ ضابطہ کارفرما نظر آتا ہے کہ چونکہ یہودی عیسائی جوتے پہن کر نماز نہیں پڑھتے اس لیے تم ان کی مخالفت کرو ارشادِ نبوی ہے۔

ان اهل الكتاب لا يصلون في خفافهم ونعالهم فصلوا في خفافكم ونعالكم[1]	بے شک اہل کتاب اپنے موزوں، جوتوں میں نماز ادا نہیں کرتے تم اپنے موزوں اور جوتوں میں نماز ادا کر لیا کرو۔

ابوداؤد کی روایت میں صراحتاً مخالفت کے لفظ موجود ہیں پس معلوم ہوا کہ اصل مقصود شریعت محمدیہ کو دیگر امتوں کی شریعت کے اختلاط سے محفوظ رکھنا ہے۔ اسی لیے امتیازی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے اہل کتاب کی مخالفت کا حکم دیا گیا ہے۔

صحابہ کرام اور کتاب و سنّت

صحابہ کرامؓ نے آپؐ کی مجلس میں بیٹھ کر جو علم دین حاصل کیا۔ وہ اس کی حفاظت اور اشاعت میں زندگی بھر کوشاں رہے۔ انہوں نے لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کے حقیقی تقاضوں کو صحیح معانی میں سمجھا۔ اور اسی اصل پر قائم رہے۔ جب بھی انہوں نے معمولی سا تغیر و تبدل دیکھا۔ تو فوراً اس کے خلاف محاذ آرا ہو گئے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قصہ جو دارمی میں موجود ہے۔ اس سے صاف صاف پتہ چلتا ہے۔ کہ کس طرح عبداللہ بن مسعود نے ایسے کام کو جو بظاہر نیک کام تھا۔ بدعت قرار دیا۔

---

[1] ابوداؤد (۲ ۶۵۲) عن شداد بن اوس سند صحیح ہے۔ جامع الصحیح ۔ ۵ ۔ ۳۲۰ وتخریج المشکوٰۃ ۵ ۷۶۵ علامہ البانی نے صحیح کہا ہے۔

اس لیے کہ اُس کا ثبوت کتاب وسنّت میں نہیں تھا۔

واقعہ حضرت عبداللہ بن مسعود کوفہ کی جامع مسجد میں داخل ہوتے ہیں۔ تو کیا دیکھتے ہیں۔ کہ مسجد میں لوگ مختلف حلقوں میں بیٹے ہوئے ہیں۔ ہر حلقہ کے درمیان کنکریوں کا ڈھیر ہے۔ اور ہر حلقہ پر ایک آدمی کھڑا ہے۔ جو ان سے کہتا ہے۔ کہ سو بار سبحان اللہ کہو۔ لوگ سبحان اللہ کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر وہ کہتا ہے۔ سو بار الحمد للہ کہو۔ لوگ الحمد للہ کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر وہ کہتا ہے۔ سو بار اللہ اکبر کہو۔ لوگ اللہ اکبر کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ان کو اس حالت میں دیکھ کر خبردار کیا۔ اللہ کی قسم کیا تم اب ایسے دین پر ہو۔ جو اللہ کے رسول کے دین سے زیادہ ہدایت والا ہے۔ یا تم گمراہی کے دروازے کو کھول رہے ہو۔[1]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مقصد واضح تھا کہ کیا یہ سچ ہے۔ کہ جو کام تم کر رہے ہو۔ یہ کام اللہ کے رسول سے تو ثابت نہیں۔ تو کیا تم اپنے آپ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے زیادہ ہدایت یافتہ تصوّر کرتے ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ لوگ قطعاً یہ نہیں سمجھتے تھے۔ کہ وہ لوگ اللہ کے رسول سے زیادہ افضل یا زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔ جب منطقی طور پر اس بات کی نفی ہو جاتی ہے۔ تو پھر ایک ہی صورت باقی رہتی ہے۔ کہ انہوں نے اس طرح کا عمل کر کے گمراہی کے دروازے کو کھول دیا ہے۔ اور جب وہ لوگ حضرت عبداللہ بن مسعود سے کہتے ہیں۔ کہ اگرچہ اس طرح کا عمل ثابت نہیں ہے۔ لیکن ہمارا مقصد اچھا ہے۔ ہماری نیت نیک ہے۔ اس پر

---

[1] ۶۸۔ لیکن الفاظ کا کچھ اختلاف ہے۔ حدیث کی سند جید ہے۔ استاذی المکرم علامہ البانی نے (الرد علی التعقب الحثیث ص ۴۵ میں اس کو صحیح کہا ہے۔)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں۔ کہ تمہاری نیت میں خرابی نہیں ہے۔ اور تم بدعت کے اس عمل کے ساتھ اللہ کی رضامندی تلاش کر رہے ہو۔ لیکن کتنے ہی انسان ہیں جن کی نیت نیک ہوتی ہے۔ جب ان کا عمل سُنت کے خلاف ہوتا ہے۔ تو نیت کچھ فائدہ نہیں دیتی۔ کیا صرف نیت کسی کام کی صحت کے لیے کافی ہوسکتی ہے۔ بلکہ جب تک کوئی عمل شریعت محمدیہ کی تعلیمات کی روشنی میں ادا نہیں کیا جاتا۔ وہ قابلِ قبول نہیں ہوتا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرح دیگر صحابہ کرام بھی دین اسلام کی حفاظت میں کوشاں رہے۔ انہوں نے بھرپور جدوجہد کا مظاہرہ کیا۔ کہ افکارِ دخیلہ دین اسلام میں شامل نہ ہو جائیں۔ دراصل وہ نہیں چاہتے تھے۔ کہ اسلام کا چشمۂ صافی اجنبی تہذیب تعلیم ادب و ثقافت سے مکدر ہو۔

وہ یقین رکھتے تھے کہ کتاب و سُنّت میں کامل راہنمائی موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؓ نے ایسے وعظ کرنے والوں کو مساجد سے نکال دیا۔ جو افسانوں اور خیالی واقعات سے لوگوں کے دلوں کو اپنی جانب مائل کر رہے تھے۔ اور انہیں کھلے لفظوں میں بتا دیا۔ کہ تمہارے نزدیک کہانیاں جھوٹے واقعات کتاب و سنّت سے زیادہ اثر انداز نہیں ہونے چاہیں۔ کیا کسی مسلمان کا یہ نظریہ ہوسکتا ہے۔ کہ وہ کتاب و سنّت کو چھوڑ کر فضول واقعات اور کہانیاں بیان کر کے سامعین سے دادِ تحسین حاصل کرتا پھرے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ عبداللہ بن عمر سے منقول ہے۔ کہ اس نے ایک آدمی کو چھینک مارنے کے بعد کہتے ہوئے سُنا۔ کہ اس نے یہ الفاظ کہے۔ الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علی رسول اللہ۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا۔

ہمیں اللہ کے رسول نے یہ الفاظ نہیں سکھلائے ہیں ۔آپؐ کا ارشاد یوں ہے۔ کہ جب تم میں سے کوئی آدمی چھینک مارے ۔ تو الحمد للہ کہے۔ لیکن الصلوٰۃ والسلام علی رسول اللہ کا ذکر کسی حدیث میں موجود نہیں ہے۔[۱]

ان تمام دلائل کی روشنی میں چند حقائق اجاگر ہو کر سامنے آتے ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے ۔

پہلی حقیقت ہدایت صرف وہ ہے ۔ جو اللہ پاک اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلّم سے ثابت ہے۔ اس کے علاوہ ہر چیز گمراہی ہے ۔معلوم ہوا ۔ کہ ہدایت صرف اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سُنّت میں بند ہے ۔ ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا ایسا راستہ نہیں ہے ۔ جو اللہ پاک کے قریب کرے ۔ اور جہنم سے دور کرے ۔

دوسری حقیقت ہر وہ عقیدہ جو کتاب اللہ ۔ اور سُنّت رسول اللہ کے خلاف ہے ۔ وہ باطل عقیدہ ہے ۔ اس کے خلاف جنگ کرنا اور اس عقیدہ کو ختم کرنا فرض ہے ۔

تیسری حقیقت عبادات میں کئی قسم کی زیادتی یا کمی کرنا اگرچہ اس سے مقصود اللہ کا قرب حاصل کرنا ہو ایسی بدعت ہے ۔ جس کو چھوڑنا ضروری ہے ۔ اسی طرح اصلاح نفس کے لیے ایسے اوراد و ظائف جن کا ذکر کتاب و سُنّت میں نہیں ہے ۔ وہ بھی بدعت ہیں ۔ اگرچہ اس قسم کی بدعات کا صدور ایسے لوگوں سے ہو رہا ہو۔ جو اسلام کی طرف اپنی نسبت رکھتے ہیں ۔ اور اس کے داعی ہیں ۔

---

[۱] الترمذی (۸/۹ تحفہ) حدیث کمزور ہے ۔ طبرانی مزار

چوتھی حقیقت

جو شخص کتاب اللہ۔ اور سُنّت رسول اللہ میں کسی غیبی علم کا دعویٰ کرتا ہے۔ کہ مجھے یہ علم کسی جن وغیرہ کے ذریعہ حاصل ہوا۔ یا مجھ پر اس کا فیضان ہُوا۔ یا پردے دور ہو گئے۔ اور حقیقت منکشف ہو گئی ہے۔ یا مجھے آسمان کے قریب لے جایا گیا۔ اور مجھے یہ علم حاصل ہُوا۔ تو وہ آدمی کذاب اور خارج از اسلام ہے۔

پانچویں حقیقت

دین کے امور میں علماء کے اقوال قطعاً تسلیم نہ کیے جائیں ہاں انہیں کتاب وسُنّت پر پیش کیا جائے جو قول موافق ہو اس کو قابلِ عمل سمجھا جائے اور جو مخالف ہو اس کو رد کر دیا جائے اگر ہمیں دلیل معلوم نہ ہو تو عدم علم کی صورت میں اگرچہ کبھی علماء کے اقوال پر عمل کرنا درست ہے۔ لیکن جب ہمیں دلیل مل جائے گی تو ہم دلیل پر عمل کریں گے قول قابلِ عمل نہیں ہو گا۔

چھٹی حقیقت

صحابہ کرام دیگر تمام لوگوں سے زیادہ عبادت گذار اور پرہیزگار تھے انہوں نے فقط کتاب وسُنّت سے راہنمائی حاصل کی اس کے غیر کی جانب انہوں نے نہیں دیکھا پس جو شخص صحابہ کرام کے طریق کو اختیار کرے گا وہ ہدایت یافتہ ہے اور جو شخص ان کے طریق سے ہٹ کر دائیں، بائیں چلا گیا وہ گمراہ ہو گیا۔

تیسرا باب

تصوّف کے علم بردار ابراہیم بن ادہم کا ذکر

اگرچہ اسلام سے قبل بھی فلسفہ قدیمہ کی شکل میں تصوف موجود تھا اور یونان، ہندوستان، ایران کے فلاسفہ اور شعراء کا اس کے ساتھ گہرا رابطہ تھا جیسا کہ ان کے کلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور تصوف کا انداز جس طرح قبل از اسلام تھا اسی طرح بعینہ بعد از اسلام بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ چنانچہ ظہورِ اسلام کے وقت جو صوفیاء اس میدان میں متحرک نظر آتے ہیں ان میں ابراہیم بن ادہم بھی ہیں۔ جو حقیقتاً تصوف کے علم بردار تھے یہ شخص کون تھے انہوں نے کب اور کن حالات میں اپنے آپ کو اس کے سپرد کیا اور اس نے تصوف کے فن میں کون سی تبدیلیاں کیں ان سوالات کے جواب میں ہم طبقات الصوفیہ کے مؤلف ابوعبدالرحمان سلمی کی چند عبارتیں پیش کرتے ہیں ان سے ابراہیم بن ادہم کی شخصیت نمایاں انداز میں سامنے آجائے گی۔

ابوعبدالرحمن اسلمی کا تبصرہ ابراہیم بن ادہم بلخ کے باشندے تھے شاہانہ زندگی کو خیرباد کہہ کر قاضی فضیل سفیان ثوری کی مجلس میں رہنے لگے شام میں سکونت اختیار کرلی اور وہیں ۱۶۱ھ ہجری میں فوت ہوئے۔

ابراہیم بن ادہم کی زندگی میں کیسے انقلاب آیا

ابوعبدالرحمٰن سلمی سند کے ساتھ ابراہیم بن بشار سے بیان کرتے ہیں کہ میں شام میں ابراہیم بن ادہم کی رفاقت میں تھا میرے ساتھ دو اور ساتھی بھی تھے ایک کا نام ابویوسف غسولی اور دوسرے کا نام ابوعبداللہ سنجاری تھا۔ میں نے ابراہیم بن ادہم سے دریافت کیا آپ میں کیسے انقلاب آیا اس نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ میرا باپ خراسان کے شاہی خاندان سے تھا یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں جوان تھا۔ میں سواری پر سوار ہو کر شکار کرنے جنگل کی طرف نکلا شکاری کتا میرے ساتھ تھا میں خرگوش یا لومڑی کا شکار کرنا چاہتا تھا میں اس تلاش میں اِدھر اُدھر سرگردان بادیہ پیمائی کر رہا تھا کہ اچانک ہاتف نے آواز دی (اگرچہ مجھے آواز دینے والا نظر نہیں آ رہا تھا) اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا اے ابراہیم کیا تمہیں اس لیے پیدا کیا گیا تھا یا تمہیں اس کام کا حکم دیا گیا تھا ؟ میں اس غیبی آواز سے گھبرا گیا سکتہ کے عالم میں پاؤں نے چلنا چھوڑ دیا لیکن ذرا توقف کے بعد میں نے پھر شکار کی تلاش میں سواری کو ایڑی لگائی دوبارہ مجھے پہلی آواز سے سابقہ پڑا اور میں قدرے رک گیا تیسری بار پھر میرے کان کسی متعارف آواز سے ہمکنار ہوئے اور میں نے اپنے آپ کو سنبھالا دیا کہ اچانک زین سے آواز آنی شروع ہوئی اور مجھے کہا جا رہا تھا کہ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ آپ ان کاموں کے لیے پیدا نہیں ہوئے اور نہ ہی آپ کو ان کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان کلمات نے میری زندگی کی کایا پلٹ دی چنانچہ میں سواری سے اترا اور ملازم چرواہا (جو ہماری بکریاں چرا رہا تھا) سے اُون کا جبہ لیا وہ خود پہن لیا اور اپنا لباس اسے پہنا دیا۔ ام

جس گھوڑے پر میں سوار تھا وہ بھی اس کے قبضے میں دے دیا اور میں نے مکہ مکرمہ کا رُخ کیا ابھی میں اسی جنگل میں چل رہا تھا کہ میری ملاقات ایک ایسے انسان سے ہوئی جس کے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز نہ تھی سورج غروب ہوا اُس نے مغرب کی نماز ادا کی اور کچھ کلمات کہے جنہیں میں نہ سمجھ سکا۔

لمحہ بھر توقف کے بعد میں کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے ایک برتن میں کھانا اور دوسرے میں پانی آگیا میں نے کھانا تناول کیا اور پانی پیا اس شخص کے ساتھ کئی روز تک مجھے رفاقت نصیب رہی اس دوران اس نے مجھے اسم اعظم سے آگاہ کر دیا تھا پھر یکایک وہ غائب ہوگیا اور میں تنہا رہ گیا ایک روز جب کہ میں تنہائی سے تنگ آچکا تھا بارگاہِ رب العزت میں ہاتھ اُٹھائے تھا میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک انسان نے میری کمر کو پکڑا ہوا ہے۔ اور مجھ سے کہہ رہا ہے جو کچھ مانگنا ہو مانگ لیجیے آپ کو محروم نہیں کیا جائے گا اس بات سے مجھے گھبراہٹ ہوئی تو اس نے کہا آپ کیوں گھبرا رہے ہیں میں تو تیرا بھائی خضر ہوں اور جس نے تجھے اسم اعظم سکھلایا تھا وہ میرا بھائی داؤد تھا جب بھی آپ اپنے کسی دشمن کو ہلاک کرنا چاہیں گے تو اسم اعظم پڑھ کر اس کی ہلاکت کی دعا کریں وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ لیکن جب آپ اسم اعظم پڑھ کر اپنے لیے دعا کریں گے تو آپ کی زندگی میں انقلاب آجائے گا۔ بزدلی کی جگہ شجاعت اور ضعف و اضمحلال کی جگہ تقویت اور تصلب اور پریشانی کی جگہ سکون کی دولت حاصل ہوگی اور اللہ کے ساتھ تیرا تعلق دن بدن زیادہ ہو جائے گا۔ یہ کہا اور مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ [1]

---

[1] طبقات الصوفیہ ص ۲۹-۳۰-۳۱)

دوسرا واقعہ

ابو عبدالرحمن سلمی طبقات الصوفیہ میں سند کے ساتھ عثمان بن عمارہ سے بیان کرتے ہیں کہ ابراہیم بن ادہم نے مجھے اسلم بن یزید جہنی کے متعلق بتایا کہ میری ملاقات اس سے اسکندریہ میں ہوئی اس نے مجھ سے میرے متعلق دریافت کیا میں نے جواباً کہا کہ میرا گھر خراسان میں ہے اس نے دوسرا سوال یہ کیا کہ آپ نے کس لیے دنیا سے بے رغبتی کرلی ہے میں نے جواب دیا اصل بات تو یہ ہے کہ مجھے دنیا سے نفرت ہو چکی ہے اس کے ساتھ ساتھ اللہ پاک سے ثواب کی امید بھی رکھتا ہوں اس نے کہا یاد رکھو ثواب کی امید رکھنا اس وقت مناسب ہے جب آپ صبر کے دامن کو مضبوطی سے تھام رکھیں اس کی رفاقت میں رہنے والے ایک نوجوان نے اس سے استفسار کیا بتاؤ صبر کس کو کہتے ہیں اس نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ صبر کی منزل یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو مشقتوں اور تکلیفوں کا خوگر بنا دے۔ میں نے سوال کیا پھر کیا حاصل ہو گا اس نے جواب دیا جب وہ تکلیفوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے گا تو اس کا دل منور ہو جائے گا میں نے سوال کیا منور ہونے سے کیا مقصود ہے اس نے جواب دیا کہ اس کے دل میں روشنی کا چراغ جلنے لگے جس سے وہ حق و باطل میں امتیاز کر سکے گا۔ ناسخ، متشابہ آیات کے احکام کو معلوم کر سکے گا یہ سن کر میں نے جواب دیا کہ یہ صفت تو اولیاء اللہ کی ہے۔ اس پر وہ تعجب آمیز لہجہ میں استغفر اللہ کہنے لگا اور مجھے ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔ کہ حضرت عیسیٰ بن مریم نے کتنی صاف اور واضح حقیقت سے پردہ کشائی کی ہے۔ کہ جب تم نالائق لوگوں کو علم و حکمت کی باتیں بتاؤ گے، تو علم و حکمت ضائع ہو کر رہ جائے گا۔ اسی طرح اگر تم علم و دانش

کی باتیں کم فہم نجس لوگوں کے سامنے بیان کرو گے۔ تو تمہیں ظالم کہا جائے گا۔ اس کی ان باتوں کو سُن کر میں دم بخود ہو گیا۔ اور ٹکٹکی باندھ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میری معنے خیز نگاہیں اس سے وضاحت کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ میرے دیگر رفقاء بھی اسی خیال میں تھے۔ کہ اس نے کہنا شروع کر دیا۔ نوجوانو، جب تمہیں نیک انسانوں کی مجلس میں بیٹھنے اور ان کی باتیں سننے کا موقعہ ملے۔ تو تم نے انہیں کبھی ناراض نہیں کرنا ہو گا۔ اگر وہ ناراض ہو گئے۔ تو اللہ پاک بھی تم سے ناراض ہو جائے گا۔ اور اگر تم ان کو خوش رکھو گے۔ تو اللہ پاک تم پر خوش ہوں گے۔ اس لیے کہ ان کا مقام بارگاہِ خداوندی میں انبیاء اور صدیقین سے بعد ہے۔ چونکہ وہ لوگ دنیوی زندگی میں اللہ کی رضا جوئی کے لیے لوگوں کو ناراض کر لیتے ہیں۔ اس لیے وہ قیامت کے دن اللہ کے مقربین میں سے سمجھے جائیں گے۔ نوجوانو گہرے غور و فکر کے ساتھ میری نصیحتوں کو سنو۔ جہاں تک ہو سکے۔ اپنی زندگی کو مشکلات اور مصائب سے ہمکنار رکھو۔ عجلت تیز مزاجی، ہلاکت آفرینی کا مظہر ہوتی ہے۔ حلم گہرا غور و فکر اور حیا بہترین اوصاف ہیں۔ لیکن کم عقلی اوسے وقوفی نحوست کی آئینہ دار ہیں۔ اس کی ان باتوں سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ دل پر رقت طاری ہو گئی۔ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور اپنے متعلق صاف صاف کہہ دیا خدا کی قسم صرف اللہ کی محبت کے لیے میں نے اپنے والدین اقربا کو چھوڑا ہے۔ اور مال و دولت کی حرص کو خیر باد کہتے ہوئے دنیا کی آسائشوں سے الگ تھلگ رہنے لگا ہوں۔ بس یہی آرزو ہے۔ کہ اللہ کی مجاورت حاصل ہو جائے۔ میری ان باتوں کو قطع کرتے ہوئے وہ اپنی پند و نصائح کا سلسلہ شروع کر دیتا ہے۔ اور کہتا ہے۔

نوجوانو! جہاں تک ممکن ہو بخل سے دور رہو۔ میں نے سوال کیا۔ بخل کس کو کہتے ہیں۔
اس نے جواب دیا کہ دنیادار لوگ تو اس انسان کو بخیل سمجھتے ہیں جو مال خرچ کرنے سے
گریز کرتا ہے۔ لیکن آخرت کے لحاظ سے وہ انسان بخیل ہے جو اپنے نفس کی قربانی
نہیں کرتا۔ یاد رکھو۔ کہ جب کوئی بندہ اللہ کی راہ میں جان قربان کرنے کے لیے تیار
ہو جاتا ہے۔ تو اس کے دل میں ہدایت کی مشعل روشن ہو جاتی ہے۔ وہ اگر ایک طرف
امن اطمینان اور وقار کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ تو دوسری طرف اس کے
علم کی شعائیں مزید روشن ہوتی ہیں۔ اور اس کی عقل کو جلا حاصل ہوتا ہے۔ نتیجتاً
اس کے لیے آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور وہ انسان اپنے دل کی آنکھوں
کے ساتھ دروازوں کے کھلنے کو محسوس کرتا ہے۔ اور اس کی قوت حدسیہ تیز ہو جاتی
ہے۔ اگرچہ دنیادار لوگ اس قسم کے انسان کو اپنی مجلسوں میں نہیں آنے دیتے۔ اس
کی آمد پر دروازے نہیں کھولتے اور کسی دعوت میں اسے مدعو نہیں کیا جاتا۔ اس کی
ان باتوں کو سن کر اس کے ایک ساتھی نے میرے متعلق کہا: کہ یوں محسوس ہو رہا ہے
کہ اس نوجوان میں کچھ مقام ولایت کی خصوصیتیں موجود ہیں۔

اگرچہ وہ بظاہر آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ اور جب اسے مختلف حلقوں کی طرف
سے مارا پیٹا جائے گا۔ تو اس کا جوہر نکھر کر سامنے آجائے گا۔ یہ سن کر شیخ اسلم بن
یزید متعجب ہوئے۔ کہ یہ انسان مقام ولایت پر فائز ہے۔ مجھے خصوصیت کے
ساتھ مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اے نوجوان مستقبل میں یقیناً تجھے نیک لوگوں کی
رفاقت حاصل ہوگی۔ تو تیرے لیے ضروری ہے کہ تو ان کے سامنے نہایت تواضع
اور انکساری کی حالت میں رہے۔ اگرچہ تجھے ان کی طرف سے بہت زیادہ

اذیتیں کیوں نہ پہنچیں۔ اور تجھے مارا پیٹا جائے گالی گلوچ کی جائے۔ مجلس سے نکال دیا جائے۔ بُرا بھلا کہا جائے۔ ان تمام ناگفتہ بہ حالات میں بھی تو نے ان کی مخالفت نہیں کرنی ہوگی۔ غور کیجئے۔ اور اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے۔ کہ اس وقت آپ کو صرف یہ سوچنا ہے کہ تم پہلے کیا تھے۔ اور اب تم میں جو تبدیلی آئی ہے۔ وہ کس قدر تیرے لیے فائدہ مند ہے۔ جب تیرا یہ تصور پختہ ہو جائے گا۔ تو لوگوں کے دلوں میں تیری محبت موجزن ہوگی۔ اور اللہ کی نصرت اور مدد تیرے شامل حال ہو گی۔ کیا یہ حقیقت نہیں۔ کہ جب کسی انسان پر اللہ پاک کے نیک بندے ناراض ہو جائیں۔ اور اسے اپنی مجلس میں نہ بیٹھنے دیں۔ تو کیا اس انسان پر اللہ پاک ناراض نہیں ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ اگر اللہ اس پر راضی ہوتا۔ تو عوام الناس کی توجہات اس کی طرف پھیر دیتا۔ اور دنیا اس کے تابع ہو جاتی۔ اور جو شخص مقام ولایت پر فائز ہونے والوں سے دشمنی مول لیتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ صراطِ مستقیم سے بھٹک گیا ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ انسان توفیق الٰہی سے محروم ہو گیا ہے۔ تمام لوگ اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے خویش واقارب بھی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ انسان اللہ کی ناراضگی کے ساتھ ساتھ فرشتوں پیغمبروں کی ناراضگی مول لیتا ہے۔ اور یہی وہ انسان ہے۔ جس کے بارے میں ارشادِ نبوی ہے۔ کہ اس قسم کے انسان کے بارے میں اللہ کو کچھ پرواہ نہیں۔ کہ وہ کس علاقہ میں تباہ و برباد ہو گیا۔ ان کی ان باتوں کو سُن کر میں نے اپنا ایک واقعہ بیان شروع کیا کہ ایک بار کوفہ سے مکہ جاتے ہوئے میری ملاقات ایک انسان سے ہوگئی میں اس کی معیت میں چند دن رہا اس دوران وہ تقریباً

روزانہ غروب شمس کے بعد دو رکعت نفل کافی وقت لگا کر پڑھتا پھر وہ بالکل آہستگی میں کچھ پڑھنے لگتا اور فوراً ہی اس کے سامنے ثرید سے بھرا ہوا ایک پیالہ اور پانی سے بھرا ہوا آبخورہ آحاضر ہوتا جسے وہ خود بھی کھاتا اور میں بھی اس کے ساتھ شریک ہو جاتا میرے اس واقعہ سے شیخ آبدیدہ ہوا اور اس کے گرد اس کے معتقدین بھی رونے لگے اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا یہ تو میرا بھائی داؤد ہے۔ جس سے آپ کی ملاقات ہوئی ہے وہ بلخ سے ماوراء ایک بستی البارد ۃ الطیبہ میں اقامت پذیر ہے اور ان کے وہاں رہنے کی وجہ سے بستی کو بھی اعزاز حاصل ہو گیا ہے اور اسے اس پر ناز ہے شیخ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا اے نوجوان! تمہاری ان سے کیا بات چیت ہوئی؟ اور ان سے تم نے کیا کچھ حاصل کیا؟ میں نے کہا اس نے مجھے اسم اعظم بتایا شیخ نے پوچھا اسم اعظم کیا ہے؟ میں نے جواب دیا اس کو زبان پر لانا میرے لیے بہت دشوار ہے لیکن میں نے اسم اعظم پڑھ کر جو سوال کیا فوراً پورا ہوا چنانچہ ایک بار ایک انسان نے مجھے کمر سے پکڑ لیا اور کہا جو مانگنا ہے مانگ لو مجھے اس سے گھبراہٹ ہوئی اس نے کہا آپ نہ گھبرائیں میں تیرا بھائی خضر ہوں اور جس نے تجھے اسم اعظم بتایا ہے وہ میرا بھائی داؤد ہے میں تجھے تاکید کرتا ہوں کہ تو نے صرف نیک کاموں میں اسم اعظم پڑھ کر دعا کرنی ہوگی اور یاد رکھ وہ لوگ حقیقتاً زاہد ہیں۔ جنہوں نے اللہ کی رضا کا لباس پہن رکھا ہے اور اس کی محبت کی چادر سے اپنے آپ کو ڈھانپا ہوا ہے اور تسلیم و رضا کے ساتھ ان کا چولی دامن کا واسطہ ہے اس لحاظ سے جس قدر اللہ پاک کے احسانات ان لوگوں پر ہیں دوسروں پر نہیں ہیں۔ یہ کہا

اور روپوش ہوگیا یہ واقعہ سن کر شیخ متعجب ہوا اور کہا یقیناً اللہ پاک تیرے جیسے ہدایت یافتہ انسانوں کو اس مقام پر پہنچائے گا اس کے بعد شرکائے مجلس میں ایک نے دعا کی اے اللہ یہ انسان ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائے اور ہم اسے دکھائی نہ دیں ابراہیم بن ادہم بیان کرتے ہیں اس کے بعد معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں چلے گئے ؟ (طبقات الصوفیہ)

ابراہیم بن ادہم کی بیان کردہ دونوں حکایتوں میں تصوف کے اصول موجود ہیں۔ ان اصولوں سے ہی فروغ کا استخراج کیا گیا ہے۔ اب ہم ان حکایات کو زیر بحث لاتے ہوئے اصول تصوف کی ایک ایک جزئی پر تنقید کریں گے تاکہ اصل حقیقت منقح ہو کر سامنے آجائے۔ [1]

---

[1] استاذی المکرم علامہ ناصر الدین البانی فرماتے ہیں کہ ان دونوں حکایتوں کی اصل ذمہ داری مؤلف طبقات الصوفیہ پر عائد ہوتی ہے اس لیے کہ ابراہیم بن ادہم سے نقل کرنے والے وہی ہیں اور محدثین کے نزدیک سلمی کی حیثیت مجروح ہے جب کہ وہ تصوف کی حدیثوں کے وضع کرنے میں طولیٰ رکھتے ہیں اور اس سلسلہ میں پرتاثیر حکایات وقصص بیان کرنا تو کم درجے کا عیب ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سلمی قابل اعتماد نہیں ہے تو پھر ان حکایات کی تردید کرنا بھی صحیح نہیں جبکہ حکایات بیان کرنے والا ہی اس قابل نہیں کہ اس کی حکایات کو قبول کیا جا سکے تو تردید بے معنی ہے تو خیال رہے کہ اگرچہ ان کا نقل کرنا ابراہیم بن ادہم سے صحیح نہیں لیکن آئمہ صوفیا کے نزدیک یہ حکایتیں قابل اعتماد ہیں اور سلمی جیسا مورخ جو ان کا راوی ہے وہ بھی انہیں صحیح سمجھتا ہے اس لیے ان کی تردید کی ضرورت محسوس کی گئی پھر اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ہمارے نزدیک ابراہیم بن ادہم کی شخصیت مخدوش نہیں البتہ ہم ان افکار کو نظر کراہت دیکھتے ہیں جو ان سے منقول ہیں اور جن کو سلمی نے خود اعتمادی کے رنگ میں خوبصورت انداز سے

تنقید و تبصرہ

اولاً پہلی حکایت میں ابراہیم بن ادہم کا ہاتف کی آواز سننا پھر گھوڑے کی زین سے کلام سننا اور راہنمائی حاصل کرنا کیا شرعاً راہنمائی کا یہ طریقہ ثابت ہے؟ قطع نظر اس سے کہ یہ حکایت صحیح ہے یا نہیں جب ہم کتاب و سنت کے نصوص پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریقہ ہدایت اسلام کے بیان کردہ طریقہ ہدایت کے منافی ہے جب کہ اسلام میں ہدایت کا سرچشمہ اللہ کی کتاب ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو سیدھا راہ دکھانے کے لیے اتارا ہے جس میں دلائل کے ساتھ ہر دعویٰ کو اس طرح ثابت کیا ہے کہ پھر بات کرنے کی گنجائش موجود نہیں ہے یہاں تک کہ دلائل حقہ بھی قرآن کے اعجاز سے مقدم سمجھے جاتے ہیں۔ اس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے دلائل بھی اشگاف الفاظ میں ذکر کیے گئے ہیں۔

ثانیاً: مذکورہ حکایت میں ابراہیم بن ادہم کا یہ ادعاء کہ ایک بزرگ کے پرتاثیر مکالمے نے ان کی کایا پلٹ کر رکھ دی اور وہ ماں باپ ملک کو خیر باد کہہ گئے اور دنیا کی عیش کوشیوں سے منہ پھیر کر صوف کا لباس زیب تن کیا جس بناء پر صوف پہننے والے کو صوفی کا نام دیا گیا حالانکہ شریعت اسلامیہ کا ہرگز یہ تقاضا نہیں کہ ہدایت یافتہ وہ انسان ہے جو دنیا اور اس کی لذتوں سے کنارہ کش ہو جائے اور دین اسلام کو محفوظ کرنے

بقیہ حاشیہ: ذکر کیا اور ائمہ صوفیاء نے انہیں قبولیت سے نوازا اور ابراہیم بن ادہم اگرچہ صوفیاء کی فہرست میں شمار ہوتے ہیں لیکن ان صوفیا میں سے ہیں جو سنت کے جادۂ مستقیم پر رواں دواں رہے اور ان سے انحراف نہ کیا۔ جس طرح جنید بغدادی، ابو سلیمان دارانی، کرخی، سقطی اسی زمرہ میں شمار ہوتے ہیں شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے فتاویٰ میں ان کی عزیمت و استقامت کی تعریف کی ہے الفتاویٰ ۱۰/۵۱۶، ۵۱۷، ۱۱/۳۹۱ - ۳۹۳

کے لیے آبادی چھوڑ کر جنگل کی طرف بھاگ جائے، ہاں اگر بعض دنیوی معاملات شعائر الٰہیہ کی ادائیگی سے رکاوٹ بن رہے ہیں یا خطرہ ہے کہ کہیں غیر اسلامی ماحول میں معاشرت اختیار کرنے سے اس کی دینی محبت و حمیت ختم ہو کر رہ جائے گی یا فسق و فجور کی سیلاب خیز آندھیاں اس کے اسلامی جذبات کو معدوم کر دیں گی تو پھر وہاں سے منتقل ہو کر ایسی جگہ قیام کرنا چاہیے جہاں کی اکثریت صالحین پر مشتمل ہے اور وہاں کا معاشرہ اسلام کے بنائے ہوئے راستوں پر چل رہا ہے لیکن غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ابراہیم بن ادہم جنہوں نے بلخ سے ہجرت کی جو اسلامی آئین کا مرکز تھا جب کہ بیان کردہ حکایت کی روشنی میں وہ حضرت داؤد کا مسکن بھی ہے اور وہ اپنے سر کو فخر سے بلند کئے ہوئے ہے اس لیے کہ قدرت نے ان کا وہاں قیام مقدر کیا ہے تو کیا ان حقائق کی روشنی میں ابراہیم بن ادہم کے لیے کچھ جواز نکلتا ہے کہ وہ ایسی مبارک بستی سے ہجرت کر کے (جس کا نام بار دہ طیبہ ہے اور خصوصیت کے ساتھ جسے حضرت داؤد کے مسکن ہونے کا فخر حاصل ہے) جنگلات اور چٹیل میدانوں میں اپنا مسکن بنائے بظاہر اس تبادلہ آبادی کے جواز یا استحباب پر کوئی شرعی دلیل نظر نہیں آتی ہے۔

ثالثاً: مذکورہ حکایت کا ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم بن ادہم کی ملاقات جنگل میں سفر کے دوران ایک ایسے شخص سے ہوتی جس کے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز نہ تھی البتہ دست غیب سے اس کے ہاں کھانے پینے کی چیزیں آموجود ہوتیں اور ابراہیم بن ادہم بھی اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہو جاتا پھر اس شخص نے ابراہیم بن ادہم کو اسم اعظم سکھلایا اور بتلایا کہ وہ اسم اعظم پڑھ کر کوئی دعا کرے گا تو حضرت خضر آجائیں گے اور اس کی ضرورت پوری کریں گے لیکن کچھ

سمجھ نہیں آتا کہ وہ کون سا سبب ہے جو حضرت داؤد کو دوبارہ دنیا میں واپس آنے پر مجبور کر رہا ہے اور پھر انہیں از خود اس پر کیسے دسترس حاصل ہے اور پھر وہ کیسے نبوت و رسالت کے تعین کردہ حدود سے تجاوز کر کے امت محمدیہ کے کسی انسان کو اسم اعظم کی تعلیم دے سکتے ہیں جبکہ ایک حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا۔ بخدا اگر موسیٰ بھی زندہ ہو کر آجائے تو اسے بھی میری اتباع کے بغیر کوئی اور چارہ کار نہیں ہوگا بس اس صراحت کے ہوتے ہوئے ہم کیسے باور کر سکتے ہیں کہ کوئی پیغمبر امت کے ایک شخص کو دین کی تعلیم سے مزین کرے اور ایسی بات بتائے جس کا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر نہیں فرمایا ہے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمع رجلاً یدعو قائلاً اللھم انی اسألک بانی اشھد انک انت اللہ الذی لا الٰہ الا انت الاحد الصمد الذی لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد فقال صلی اللہ علیہ وسلم قد سأل اللہ باسمہ الاعظم الذی اذا سئل بہ اعطیٰ واذا دعی بہ اجاب[1]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دعا کرتے ہوئے سنا وہ کہہ رہا تھا اے اللہ میں تجھ سے اس واسطہ کے ساتھ سوال کرتا ہوں کہ تو اللہ ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو ایک ہے بے نیاز ہے۔ جس نے نہ کسی کو جنا نہ وہ جنا گیا ہے اور کوئی اس کا ہمسر نہیں (اس پر) آپ نے فرمایا اس نے اللہ سے اسم اعظم کے ساتھ سوال کیا ہے جس سے جب کوئی سوال کیا جاتا ہے تو وہ عطا کرتا ہے اور جب اس کے ساتھ دعا کی جاتی ہے تو قبول ہو جاتی ہے۔

۱؎ مسند احمد ۳۴۹/۵ -- ۳۵۰) ابو داؤد ۱۴۹۳) وغیرہ عن بریدہ بن الحصیب

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اسم اعظم اس دعا میں موجود ہے اور جب اس کے واسطہ سے دعا کی جاتی ہے تو وہ قبول ہوتی ہے لیکن اس میں یہ ذکر نہیں ہے کہ جب اسم اعظم پڑھا جاتا ہے تو حضرت خضر جلوہ آرا ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو کچھ مانگنا ہو مانگ لو تمہیں عطا کر دیا جائے گا اس قسم کی باتیں خرافات کے قبیل سے ہیں جس طرح کہ حضرت سلیمان کے بارے میں مشہور ہے کہ جب وہ اپنی انگوٹھی کو حرکت دیتے تو فوراً دیو ہیکل جن حاضر ہو جاتا۔

پھر ہم اس سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ حضرت داؤد خاص طور پر ابراہیم بن ادہم سے ہی کیوں ملاقات کرتے ہیں اور انہیں اسم اعظم بتاتے ہیں اور ان سے پہلے صحابہ کرام، تابعین عظام کو کیوں محروم رکھتے ہیں۔

پھر حضرت خضر، ابراہیم بن ادہم سے کس طرح یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ جس کسی کے ساتھ آپ کی دشمنی ہے اسم اعظم پڑھ کر آپ اسے ہلاک کر سکتے ہیں جبکہ ابراہیم بن ادہم کو ہم معصوم نہیں سمجھتے عین ممکن ہے کہ کسی وقت اس کا کسی مسلمان کے ساتھ جھگڑا ہو جائے اور وہ اس کو اسم اعظم کی برکت کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیں اسے جنت سے محروم کر دیں اور جہنم کا مستحق بنا دیں محض اس لیے کہ اس نے ابراہیم بن ادہم کے ساتھ کیوں جھگڑا کیا اور لڑائی مول لی حالانکہ اس قسم کا اعزاز تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حاصل نہیں حالانکہ آپ کا اپنے مخالفین کے ساتھ جھگڑنا محض عقیدہ اور دین اسلام کی بنیاد پر تھا کسی دنیوی مقصد کی بنا پر نہیں جبکہ آپؐ نے چند انسانوں کے حق میں بددعا کی تو اللہ پاک نے فرمایا (لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ)[1] (اس بارے میں آپ کو کچھ اختیار نہیں)

---

[1] (آل عمران ۱۲۸) آیت کا شان نزول معلوم کرنے کے لیے بخاری شریف دیکھیں۔

رابعاً: ہم دیکھتے ہیں کہ ابراہیم بن ادہم آبادی چھوڑ کر جنگل کا رخ کرتے ہیں اُون کا لباس زیب تن کرتے ہیں اپنے آپ کو مشکلات میں ڈالتے ہیں یہاں اولاً ہم اس بحث میں الجھنا پسند نہیں کرتے ہیں کہ اس طرح زندگی گزارنا شریعت اسلامیہ کے مطابق صحیح ہے یا شرعاً اس کی اجازت نہیں تاہم اس قسم کی زندگی کے نتائج کیا نمودار ہوتے ہیں۔ اس پر تبصرہ کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں مذکورہ حکایت میں موجود ہے کہ مشقت کی زندگی بسر کرنا اور اس پر صبر کرنا ایک ایسا عمل ہے جس سے دل کی آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ اور حق و باطل میں امتیاز کی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ ناسخ متشابہ آیات کا اصل مفہوم نکھر کر سامنے آجاتا ہے حالانکہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی مجاہدہ کیوں نہ کرے اور جان فروشی کا کتنا بھی مظاہرہ کیوں نہ کرے شرعاً وہ ناسخ، منسوخ، محکم، متشابہ آیات کا علم حاصل نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس میں حق و باطل کے درمیان امتیاز کی صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے جب تک کہ وہ کتاب و سنت کا علم حاصل نہ کرے اور مزاولت نہ رکھے۔ ارشاد نبوی ہے۔

(انما العلم بالتعلم) [1] (علم مزاولت سے حاصل ہوتا ہے)

---

[1] صحیح بخاری میں تعلیقاً موجود ہے ۱/۰۷ (من فتح الباری) حافظ ابن حجر نے شرح میں موصولاً ذکر کیا ہے اور سند کو حسن کہا ہے الاستاذ علامہ البانی نے السلسلۃ الصحیحۃ ۳۴۲ میں ذرا تفصیل سے ذکر کیا اور صحیح کہا ہے نیز مختصر بخاری ۱/۲۸ میں مذکور ہے کہ یہ جملہ ایک حدیث سے ماخوذ ہے جس کو ابو خثیمہ نے ص ۱۱۴ میں صحیح سند کے ساتھ ابوالدرداء سے موقوفاً بیان کیا ہے دیگر کتب حدیث میں مرفوعاً بھی ہے اور حضرت معاویہؓ سے اس کا شاہد بھی مروی ہے۔

خیال کیجئے حدیث میں یہ جملہ نہیں ہے کہ صبر سے علم حاصل ہوتا ہے اور جس قدر مجاہدہ زیادہ ہوگا اسی قدر علم زیادہ حاصل ہوگا البتہ جو شخص علم کے مطابق عمل کرتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے اسے صراطِ مستقیم کی توفیق نصیب ہوتی ہے اور اس کی بصیرت علمی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اس کے سامنے علم کی گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ اور خود بخود حصول علم کے اسباب میسر آنے لگتے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے۔

واتقوا اللہ ویعلمکم اللہ واللہ بکل شئ علیم[1]	اور خدا سے ڈرو۔ اور دیکھو کہ وہ تم کو (کیسی مفید باتیں) سکھلاتا ہے اور خدا ہر چیز کو جانتا ہے۔

مذکورہ جملہ قرآن پاک کی اطول آیت کا آخری جملہ ہے اس آیت میں قرض لینے اس پر گواہ بنانے اس کو تحریر میں لانے کا ذکر ہے اور اصل مقصود یہ ہے کہ یہ سب کچھ حصول علم کے ساتھ وابستہ ہے کیا ان چیزوں کا حصول صبر یا روزہ رکھنے سے شرعاً عقلاً ممکن ہے یا علم کے حصول کے اسباب کو حرکت میں لاتے کے بغیر ان کا حصول ناممکن ہے ظاہر ہے کہ علم شرعی تو بلا مزاولت حاصل نہیں ہو سکتا اسی طرح علم دنیوی کے حصول کے لیے تعلیم اور محنت شرط ہے لیکن مجاہدہ مراقبہ وغیرہ سے حصول علم ممکن نہیں ہے۔

اور پھر حکایت میں ان علماء کا ذکر نہیں ہے جو کتاب وسنّت کا علم رکھتے ہیں اور شریعت کے حدود سے واقف ہیں اس لیے کہ علم شریعت کے حصول میں جہاں درس وتدریس کی وادیوں سے گذرنا پڑتا ہے علمی جواہر پاروں کے تحفظ کے لیے نہ صرف حافظہ پہ بلکہ لبسا اوقات ان کو حیطۂ تحریر میں لانا پڑتا ہے۔

---

[1] (البقرہ ۲۸۲)

وہاں بارگاہِ الٰہی میں نیاز مندی کے ساتھ اس کے فہم اور اس پر عمل کی توفیق کے لیے دست سوال اُٹھانا پڑتا ہے۔ لیکن حکایت ان علماء کے ذکر سے یکسر خالی ہے۔ اس میں جن علماء کا ذکر ہے ان کا انداز ان سے سراسر مختلف ہے ان کی کد و کاوش، ان کے مجاہدات، ان کے حدود و آداب اور ان کے عادات کا علمائے شریعت کے ساتھ کچھ بھی لگاؤ نہیں پس ان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ جس قدر زندگی تلخ ہوگی اور اس میں وحشت و اذیت کے المناک مناظر ہوں گے اسی قدر علم میں گہرائی حاصل ہوگی اور بصیرت کی آنکھیں روشن ہوں گی اس کے ساتھ ساتھ تصوّف کی منازل طے کرنے کے لیے مسلسل مجاہدات کرنے ہوں گے اور اپنی جان کو مصائب کے سپرد کرنا ہوگا۔ تب جا کر ایک خاص قسم کا علم حاصل ہوگا طبیعت میں جذب و مستی کی ایسی انفعالی کیفیت جلوہ گر ہوگی کہ عالم وجد میں اگر چودہ طبق روشن ہو جائیں گے اور یہ ایک ایسی منزل ہے جہاں شریعت اسلامیہ کے علماء کا پہنچنا ناممکن ہے جیسا کہ حکایت میں اس علم کے ثمرات کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس علم سے صوفی کا دل منوّر ہو جاتا ہے وہ حقیقی سکون، اطمینان کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے اس کے وقار میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کے علم کی شدّت اس کی شخصیت کو نہایت اونچے مقام پر بیٹھا دیتی ہے اس کی عقل میں جلا رونما ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اس کے سامنے آسمانوں کے دروازے کھل جاتے ہیں اور اس کی عقل کی آنکھیں انہیں کھلتا دیکھتی ہے۔ اگرچہ دنیا دار لوگ اس کو سرگاہ پر کی حیثیت نہیں دیتے لیکن اس سے پہلے کہ ہم اس علم کی صحت یا عدم صحت پر بحث کریں ہم چاہتے ہیں کہ اس کے چند نمونے

آپ کے سامنے پیش کریں چنانچہ آئندہ اوراق میں ہم اس کا ذکر کریں گے۔

خامسًا: حکایت میں ابراہیم بن ادہم کا بیان کرنا کہ محض اللہ کی محبت کو غلبہ دیتے ہوئے میں نے ماں باپ کے پیار کو خیرباد کہا مال و دولت کو ٹھوکر لگا کر تن تنہا جنگل کا رخ کیا اور نفس کے عیش و آرام کو قربان کر کے اللہ کی مجاورت کو ترجیح دی) درحقیقت محبت الہیہ کا پیش خیمہ نہیں ہے یہاں نہ اللہ کی رضاجوئی مطلوب ہے نہ اسکی جنت کا حصول مطمح نظر ہے نہ اس کے دوزخ سے بچاؤ مقصود ہے اس لیے کہ صوفیاء کے اقوال اور ان کی عبارتوں سے مترشح ہوتا ہے کہ اس سے ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ماسوٰی تمام چیزیں فنا ہیں یعنی صرف اسی کا وجود ہے اور عابد بھی عین معبود ہے یہی وہ نظریہ ہے جو وحدت الوجود کے نام سے مشہور ہے اور نہ ہی عبادت سے ان کا مقصد جنت کا حصول یا اس کے عذاب سے رستگاری حاصل کرنا ہے۔

سادسًا: حکایت میں مذکور ہے کہ اسلم بن یزید جہنی کے رفقاء نے اسلم سے کہا کہ ابراہیم بن ادہم کو خوب مارا پیٹا جائے اس لیے کہ اس نوجوان میں مقام ولایت کے آثار نظر آرہے ہیں اور جس مقام پر یہ شخص پہنچے گا کوئی دوسرا وہاں پہنچ نہ سکے گا کیا یہ نظریہ کتاب وسنت کی تعلیمات کے موافق ہے۔

اللہ پاک تو قرآن پاک میں فرماتے ہیں کہ اللہ ہر مومن کا ولی ہے۔

اللہ ولی الذین اٰمنوا یخرجھم من الظلمٰت الی النور	جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کا دوست خدا ہے۔ کہ اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے۔

نیز ارشادِ نبوی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص

ان اللہ یقول من عادیٰ لی ولیا فقد اذنتہ بالمحاربۃ وما تقرب الی عبدی بشئ احب الی مما افترضت علیہ ولا یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتیٰ احبہ فاذا احببتہ کنت سمعہ الذی یسمع بہ وبصرہ الذی یبصر بہ الحدیث

میرے دوست سے دشمنی کرتا ہے میں نے اس کے ساتھ لڑائی کرنے کا چیلنج کر دیا اور میرا بندہ میرا قرب حاصل کرنے کے لیے فرائض کی ادائیگی سے زیادہ کسی محبوب چیز کو پیش کر کے قرب حاصل نہیں کر سکتا ہمیشہ میرا قرب حاصل کرنے کے لیے نوافل پڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں پس جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ سنتا ہے اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ دیکھتا ہے۔

اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ کی ولایت حاصل کرنے کے لیے اولاً فرائض کی ادائیگی اس کے بعد جس قدر زیادہ سے زیادہ نوافل پڑھ سکتا ہو پڑھے لیکن یہ بات کس قدر ناقابل فہم ہے کہ زمین کے کنارے سے ہاتف کی آواز آئے تو ولایت حاصل ہو جائے اور جنگل میں حضرت داؤد سے اسم اعظم سیکھ لیا جائے تو آخری منزل پر رسائی حاصل ہو جائے۔

افکار صوفیاء پر جب ہم دوبارہ قلم اٹھائیں گے تو ہم بتائیں گے کہ ان کے ہاں ولایت کے مقام کی تشریح بالکل جداگانہ ہے اور اس مخصوص منصب پر مخصوص لوگ ہی جلوہ افروز ہو سکتے ہیں جن کے فکر و عمل کا انداز بھی بالکل نرالا ہو اور انہیں اپنے ولی کامل ہونے پر پورا یقین ہو اور اس پر وہ سختی سے قائم ہوں۔

سابعاً: حکایت میں اسلم بن یزید، ابراہیم بن ادہم کی خیر خواہی کرتے ہوئے کہتا ہے اے نوجوان! تجھے نیک لوگوں کی مجلس اختیار کرنی چاہیے اور ان کی خدمت میں تواضع، انکساری کا دامن تھامے رکھنا ہو گا اگرچہ وہ تجھے برا بھلا کہیں، گالی گلوچ دیں یہاں تک کہ ان کی مار پیٹ کو بھی برداشت کرنا ہو گا۔

غور کیجئے کیا نیک لوگوں کی مجلس میں یہی کچھ حاصل ہوتا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ نیک لوگ اپنی مجلس میں بیٹھنے والوں کی عزت کرتے ہیں ان کی غلطیوں سے درگزر کرتے ہیں اچھی باتوں کی تعلیم دیتے ہیں اور بہترین کریمانہ اخلاق کا برتاؤ کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ ان کے گرویدہ ہو جاتے ہیں وہ لوگ قطعاً نیک نہیں ہیں جو گالی گلوچ کا بازار گرم رکھیں یا مار دھاڑ کا سلسلہ جاری رکھیں دراصل صوفیاء کا یہ انداز بالکل ہی نرالا ہے اور اس کا پس منظر کیا ہے؟ انشاء اللہ آئندہ اوراق میں صوفیاء کے منہج کی بحث کے ضمن میں اس کا تفصیلی نقشہ بیان کیا جائے گا۔

ثامناً: حکایت میں شیخ اسلم بن یزید، ابراہیم بن ادہم کو نصیحت کے انداز میں کہتے ہیں کہ تیری تالیج داری کرنے والے بھی اس مقام پر رسائی حاصل کر سکیں گے جہاں تم پہنچ چکے ہو ہم نے تجھے علم کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے اور تیرے فائدے کے لیے ضروری معلومات کا نقشہ پیش کر دیا ہے۔

اس عبارت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ صوفیاء کی فکر کے پیمانے اہل علم سے بالکل مختلف ہیں اور ان کا طرزِ عمل بھی بالکل نرالا ہے اور ان کا راستہ صحابہ، تابعین والا نہیں ہے جب کہ یہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ جس منزل پر ہم متمکن ہیں وہاں صحابہ، تابعین کی رسائی کہاں ہوئی ہے۔

عنقریب دلائل کی روشنی میں ہم قارئین کے معلومات میں اضافہ کریں گے کہ یہ کس راہ پر چل رہے ہیں؟ اور ان کا منتہائے مقصود کیا ہے؟

تاسعًا: حکایت کے آخر میں مذکور ہے کہ شیخ اسلم بن یزید کے گرد جمع ہونے والے لوگوں میں سے ایک نے کہا اے اللہ! تو اسے ہماری نظروں سے اوجھل کر اور ہمیں اس کی نظر سے اوجھل کر تو فوراً سب غائب ہو گئے اور کچھ پتہ نہ چلا کہ کہاں گئے؟

خیال کیجئے اس میں ان لوگوں کے نہ نظر آنے کا ذکر ہے جو کہ عجیب وغریب ہی نہیں بلکہ ناقابل فہم ہے جیساکہ حکایت کے شروع میں ہاتف کی آواز کہ کیا تم اس کام کے لیے پیدا ہوئے ہو یا تمہیں اس کا حکم دیا گیا ہے بھی قابل فہم نہیں ہے اس قسم کی حکایتیں عجیب وغریب مناظر پیش کر رہی ہیں جن کی صداقت غیر یقینی ہے آیندہ اوراق میں ان سے بھی زیادہ عجیب وغریب حکایات بیان کی جائیں گی۔ کہ مذکورہ حکایات ان کے مقابلہ میں کسی حد تک قابلِ قبول متصور ہوں گی تاکہ ان کا صوفیاء کا واضح نقشہ ناظرین کے سامنے آجائے۔

بحث کا خلاصہ اس تمام بحث پر غور وفکر کے بعد ہم نہایت آسانی کے ساتھ چند اہم نکات پیش کرتے ہیں جنہیں بحث کا خلاصہ کہنا مناسب ہے۔

پہلا نکتہ: ہاتف کی راہنمائی صحیح راہنمائی ہے۔

دوسرا نکتہ: اس راہنمائی کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا اور اس کی لذات کو خیر باد کہہ دیا جائے گھر بار ماں باپ کو چھوڑ کر جنگلوں پہاڑوں کی غاروں میں آبادی اختیار

کی جائے۔

تیسرا نکتہ: جس شخص کو یہ مقام حاصل ہو جاتا ہے وہ حضرات انبیاء کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور ان کے ساتھ باتیں کرتا ہے اس کا کھانا غیب سے آتا ہے۔

چوتھا نکتہ: حضرت خضر اسم اعظم کا ورد کرنے والے کے خادم ہیں وہ اس کی جملہ ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں اگرچہ کوئی صوفی طاقت نہیں رکھتا کہ اس کو زبان پر لائے۔

پانچواں نکتہ: صوفی اس راہ پر چل کر آسمان کے قریب ہو جاتا ہے اس کے لیے آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں اور اسے علم لدنی حاصل ہو جاتا ہے۔

چھٹا نکتہ: صرف یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر مقام ولایت پر رسائی ہوتی ہے۔

ساتواں نکتہ: اپنے رفقاء کی بدسلوکی پر صبر کرنا بلکہ اس کو بدسلوکی نہ سمجھنا اور ان کے سامنے گردن جھکا دینا سر تسلیم خم ہو جانا ولایت کی علامت ہے۔

آٹھواں نکتہ: صوفیاء کا مقام دیگر لوگوں کے مقام سے انوکھا اور اہم ہے اس لیے کہ یہ لوگ بلاواسطہ اللہ کی ذات سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں اور اپنے مخصوص علم کا پرچار کرتے ہیں۔

نواں نکتہ: ایک ہی دعا سے پوشیدہ چیز ظہور میں آجاتی ہے اور موجود چیز آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

تیسرا باب

اسلام اور تصوّف

تصوّف کا راستہ کتاب وسُنّت سے بالکل الگ تھلگ ہے اسی لیے صوفی کتاب وسُنّت سے مستغنی رہتا ہے کبھی وہ ہاتف کی آواز سے راہنمائی حاصل کرتا ہے اور اس کے علاوہ بھی کچھ صورتیں ایسی ہیں جن سے وہ حقائق معلوم کرنے میں کوشاں رہتا ہے اس کتابچہ میں ہم ان کا ذکر کریں گے انشاء اللہ۔

علم تصوّف کتاب وسنّت سے فائق ہے

صوفیاء اس نظریہ کے حامل ہیں کہ نہ صرف یہ کہ ان کے پاس جو علم ہے وہ کتاب وسُنّت کے علم سے بہتر ہے۔ بلکہ کتاب وسُنّت کا علم ان کے راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ چنانچہ چند عبارات ملاحظہ فرمائیں۔

ابویزید بسطامی کا قول

ابویزید بسطامی متوفی ۲۶۱ھ شریعت اسلامیہ کے علماء پر تنقید کرتے ہوئے فخریہ انداز میں کہتا ہے۔

اخذ تم علمکم میتاً عن میت و	تم نے اپنا علم فوت شدہ لوگوں سے حاصل کیا ہے
اخذ نا علمنا عن الحی الذی لا یموت	اور ہم نے اپنا علم اس ذات سے حاصل کیا ہے جو
یقول امثالنا حدثنی قلبی عن ربی	ہمیشہ سے زندہ ہے اس پر کبھی موت طاری نہیں ہو

وانتم تقولون حدثنی فلان واین هو؟ قالوا مات عن فلان واین هو؟ قالوا مات[1] فتوحات مکیة ج۱ص۳۶۵	گی ہم اور ہمارے جیسے تو کہتے ہیں کہ میرے دل پر میرے رب کی طرف سے القاء ہوا اور تم کہتے ہو کہ مجھے فلاں نے حدیث بیان کی لیکن بتاؤ وہ کہاں ہے؟ جواب ملا وہ فوت ہوگیا ہے اس نے فلاں سے بیان لیا لیکن وہ کہاں ہے جواب ملا وہ بھی فوت ہوگیا ہے۔

جنید بغدادی کا قول

ما اخذنا التصوف عن القیل والقال (طبقات السلمی ۱۵۸)	علم تصوّف کا ماخذ قیل وقال نہیں ہے یعنی قیل وقال علم شریعت میں ہے۔

نیز وہ کہتے ہیں:

احب للمبتدی ان لا یشتغل قلبہ بھذہ الثلاث والا تغیرت حالہ التکسب وطلب الحدیث والتزوج احب للصوفی ان لا یقرء ولا یکتب لانہ اجمع لھمہ	مبتدی کے لیے مستحب ہے کہ اس کا دل تین چیزوں کی الائش سے بچا رہے ورنہ حالت دگرگوں ہوجائے گی نہ تو وہ کسی کام میں مشغولیت اختیار کرے نہ وہ علم حدیث طلب کرے۔

---

[1] الاستاذ علامہ ناصر الدین البانی فرماتے ہیں اگرچہ فتوحات مکیہ قابل اعتماد نہیں ہے تاہم صوفیاء کے ہاں یہ کتاب قابل اعتماد ہے اس میں ابو یزید بسطامی اور دیگر ائمہ صوفیاء سے جو اقوال منقول ہیں وہ صوفیاء کے ہاں قابل حجت اور قابل اعتماد ہیں لہذا کوئی شخص ہم پر یہ اعتراض نہ کرے کہ آپ اس قسم کی باتوں کو کس لیے ابو یزید بسطامی کی طرف منسوب کر رہے ہو ہمارا مقصد فقط یہ ہے کہ تصوّف کی حقیقت کو ان کی کتابوں سے آشکارا کیا جائے۔

(قوت القلوب ۱۳۵/۱)

نہ وہ نکاح کرے اور صوفی کے دل کو اس سے بہت زیادہ سکون حاصل ہو گا کہ وہ پڑھنا لکھنا چھوڑ دے۔

ابو سلیمان دارانی کا قول

اذا طلب الرجل الحدیث او سافر فی طلب المعاش او تزوج فقد رکن الی الدنیا۔

جب کوئی شخص حدیث کا علم حاصل کرنے لگے یا طلب معاش کے لیے سفر اختیار کرے یا رشتہ زوجیت میں منسلک ہو جائے تو وہ دنیا دار ہے۔

یہ چند اقوال بطور نمونہ کے ذکر کر دیئے گئے ہیں ورگرنہ اس مضمون کے اقوال کثرت کے ساتھ مذکور ہیں جو علم شریعت کے طلب سے کنارہ کش رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور کشف القاء کے ذریعہ علم حاصل کرنے کی رغبت اجاگر کرتے ہیں۔

پس کیا منصف مزاج اللہ سے خوفزدہ رہنے والے سچی بات کہنے والے انسان پر یہ بات مخفی رہ سکتی ہے؟ کہ مذکورہ تمام اقوال شریعت اسلامیہ کو ختم کرنے کی ترغیب دلا رہے ہیں بلکہ عمرانیات کے قلع قمع کرنے میں مؤثر کردار ادا کر رہے ہیں جبکہ شریعت کے بقاء کا انحصار تین چیزوں پر ہے علم کے زیور سے آراستہ ہو کر معاشیات کے حصول کے لیے تگ و دو کی جائے اور نسل کی بقاء کے لیے ازدواجی مسرتوں سے ہمکنار ہو کر بہترین معاشرہ تشکیل دینے کی بھرپور کوشش کی جائے جب اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے لیے یہ تینوں عناصر اس قدر اہمیت کے حامل ہیں تو ان سے اجتناب کر کے کس طرح کامیاب زندگی بسر کی جا سکتی ہے پھر اسلامی معاشرہ نہ صرف یہ کہ انسان کو دنیوی علوم کی ارتقاء کے لیے کد و کاوش کرنے کا حکم دیتا ہے اور کائنات کی خدمت کے لیے نئے نئے ایجادات و انکشافات میں مساعی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے بلکہ کتاب و سنت کے علم حاصل کرنے پر پورا زور دیتا ہے اور اخروی

زندگی کی تفصیلات سے آگاہ ہونے کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اور کھلے لفظوں میں اعلان کرتا ہے کہ جو شخص اعمال صالحہ کرتا ہے آخرت میں اس کا بدلہ اس کو ضرور مل کر رہے گا اور کسی پر ظلم نہیں ہوگا پھر اخروی زندگی کو ہی اصل زندگی قرار دیا گیا ہے۔

کشف فیصلہ کن ہے

صوفیاء نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ لوگوں کو علم شریعت سے متنفر کرنے میں پورا زور لگایا بلکہ انہوں نے کشف، الہام، القاء کو حدیث اور اس کی سند پر غلبہ عطا کیا اور نہایت دیدہ دلیری سے محدثین کے فیصلوں کو غلط قرار دیتے ہوئے کہا کہ اصل فیصلہ کشف، القاء کا ہے۔ ہمارا کشف جس حدیث کی سند کو صحیح قرار دے گا وہ حدیث صحیح متصور ہو گی اگرچہ محدثین نے اس کی سند کو ضعیف کیوں نہ کہا ہو اور اگر کشف کسی حدیث کو ضعیف قرار دے گا تو وہ حدیث ضعیف ہی سمجھی جائے گی اگرچہ محدثین نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہو اور حدیث کی صحت، عدم صحت کے لیے جو پیمانے انہوں نے وضع کیے ہیں اور جن اصطلاحات کو انہوں نے اگرچہ کافی غور و خوض کے بعد معیار قرار دیا ہے وہ ہمارے نزدیک قابلِ اعتنا نہیں ہیں۔

کیا یہ لوگ محدثین کے سنہری کارناموں کو (جو درحقیقت قابل فخر ہیں) مضحکہ خیز نہیں سمجھ رہے ہیں۔ اور کیا کسی امت میں اس نظریہ کے حامل لوگ موجود ہیں کہ حدیث کی صحت، عدم صحت کا دار و مدار کشف پر ہے اسناد کی کچھ حیثیت نہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر دین اسلام افکارِ دخیلہ اقوال زنادقہ اور ملاحدہ سے محفوظ ہے تو یہ صرف علم اسناد کی برکتوں کا نتیجہ ہے اگر علم اسناد نہ ہوتا تو ہر شخص دین میں اپنی آراء کو داخل کر سکتا تھا۔ وللہ الحمد

ابن عربی کا قول

چنانچہ ابن عربی علم اسناد کا استخفاف کرتے ہوئے اور تصوف کے خاص علم کشف کی مدح سرائی کرتے ہوئے کہتا ہے۔

وربما قالوا ای علماء الشریعۃ اذا عاینوھم ای عاینوا علماء الصوفیۃ یتکلمون بمواجیدھم مع اصحابھم دین مکتوم دین مشئوم وما عرفوا جھات الدین وھؤلاء ما تکلموا بالدین نقطوا وانما تکلموا بنتائج وما وھبھم الحق تعالیٰ فی طاعتہ حین اطاعوہ وبما صح عندھم من احادیث الاحکام ما اتفق علیٰ ضعفہ وتجریح نقلتہ وھم اخذوہ عن الکشف عن قائلہ صحیحًا فتعبدوا انفسھم علیٰ غیر ما تقرر عند علماء الرسوم فینسبونھم الی الخروج عن الدین وما انصفوا فان

علماء شریعت جب صوفیاء کو دیکھتے ہیں کہ وہ وجد کے عالم میں اپنے رفقاء سے ہم کلام ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ان کا دین ظاہری شریعت نہیں ہے ان کا دین تو منحوس ہے یہ لوگ دین اسلام کو جانتے ہی نہیں ہیں۔ پھر ان لوگوں نے صرف دین اسلام کو پردۂ خفا میں ہی نہیں ڈال رکھا ہے بلکہ اس کے ثمرات کو بھی عوام الناس سے چھپاتے ہیں اور اللہ کی اطاعت پر جس اکرام و اعزاز سے نوازے جاتے ہیں اور جن حدیثوں کے ضعف اور ان کے رواۃ کے مجروح ہونے پر اتفاق ہو چکا ہے ان کو بھی لوگوں سے چھپاتے ہیں اور اس قسم کی حدیثوں کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کشف کا سہارا لیتے ہیں اور ان کی عبادت کے طریقے غیر اسلامی ہیں جو انہیں دین اسلام سے خارج قرار دے رہے ہیں حالانکہ ان کی یہ باتیں انصاف پر مبنی نہیں ہیں اس لیے کہ حق و سچ صداقت حاصل کرنے کے راستے مختلف ہیں

للحق وجوهاً يوصل اليه منها هذا احدها
ورب حديث قد صححوه واتفقوا عليه
ليس بصحيح عندهم من طريق الكشف و
يتركون العمل به مثل ذلك سواء
(رسائل ابن عربی ص ۴)

ان میں سے جو راستہ بھی اختیار کیا جائے وہ منزل مقصود تک پہنچا دے گا ان میں سے کشف بھی ہے چنانچہ متعدد ایسی حدیثیں ہیں جو محدثین کے نزدیک صحیح ہیں لیکن کشف کے لحاظ سے وہ صحیح نہیں ہیں۔ اس لیئے وہ (صوفیا) اس پر عمل نہیں کرتے ہیں۔

مذکورہ حوالہ اس بات کا پتہ دے رہا ہے کہ صوفیاء کے ہاں حدیث کی سند کی صحت کی پہچان کشف[1] پر ہے یعنی وہ بذریعہ کشف رسول اکرم سے ملاقات کرتے ہیں اور حدیث کی صحت عدم صحت پر آپ سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں تو کیا کشف کو فیصل ماننے کی شکل میں محدثین کے وضع کردہ قواعد کی عمارت کو منہدم کر دینا نہیں ہے اور کیا اس سے قصر سنّت کی عمدگی، آرائش ختم ہو کر نہ رہ جائے گی بلکہ مکمل دین اسلام ان لوگوں کی چیرہ دستیوں کا نشانہ نہ بن جائے گا اور پھر کیا اس کی حیثیت کھیل تماشہ سے کچھ زیادہ ہوگی اور جس قدر ضوابط و قواعد مرتب شکل میں نظر آ رہے ہیں ان کی ایک جزئی بھی قابل عمل نہ رہے گی جب کہ صرف اور صرف کشف، علم غیب کو ہی بالادستی حاصل ہوگی۔

پھر اسی پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ ایسے اصول وضع کیے گئے جن کے وضع کرنے سے مقصود یہ تھا کہ شرعی علوم کا جنازہ نکال دیا جائے اور عوام الناس کو

---

[1] دل سے حجابات کا زائل ہو جانا بقول صوفیاء کے غیبی مناظر کا نظر آنا اگرچہ ابن عربی اس مقام پر کشف سے مراد یہ لے رہا ہے کہ صاحب کشف کا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اتصال ہو جاتا ہے اور بلا واسطہ آپ سے علم حاصل ہوتا ہے۔

ان سے باغی بتایا جائے اور ممکنہ ذرائع کے ساتھ ان کے شجرۂ طیبہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا جائے۔

مزید براں انہوں نے علم کو عیب قرار دیا اور اس کے چھپانے کا حکم دیا یہاں تک کہ صوفیاء کی کتب میں مذکور ہے کہ ایک شیخ نے جب اپنے مرید کو دیکھا کہ اس کے ہاتھ سے دوات گر گئی ہے تو اس سے کہا اپنے اس لکھنے پڑھنے کے عیب کو چھپا رکھو۔[1]

صوفیاء نے علم شریعت کے مقابلہ میں جب علم حقیقت کو لاکھڑا کیا تو وہ جس قدر علم شرعی ظاہری کے خلاف غلط پروپیگنڈا کر سکتے تھے انہوں نے اس میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اس کے مقابلہ میں علم حقیقت یعنی علم باطنی کے قواعد کو خوب صورت پُر کشش بنا کر پیش کیا اور برملا دعوٰی کیا کہ علم حقیقت تک رسائی کے لیے فیض رحمانی، فتح ربانی اور کشف کی ضرورت ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا علم باطنی سے ان کی مراد دلوں کی اصلاح تھی جیسا کہ بعض صوفیاء یہی دعوٰی کرتے ہیں لیکن اس سے ان کا مقصود صرف یہ تھا کہ اس خاص علم کے ذریعہ ان پر حقائق کا انکشاف ہوگا اور آنکھوں سے اوجھل چیزوں کو وہ بآسانی دیکھ سکیں گے اس علم کی فضیلت پر انہوں نے مبالغہ آرائی کا مظاہرہ کیا اور مخالفین پر شدید تنقیدی حملے کیے اگرچہ ابتداءً انہوں نے علم کشف کو راز داری میں رکھا لیکن زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ انہوں نے اس کو کھلے بندوں پیش کیا اور اس کی اشاعت میں سرگرمی دکھائی جب انہوں نے لوگوں کے رجحان کو دیکھا کہ وہ دن بدن اس طرف بڑھتا جا رہا ہے۔

---

[1] تلبیس ابلیس لابن الجوزی ص ۳۷۰

تیسری صدی ہجری کے آغاز میں صوفیاء نے کھلے بندوں علم باطنی کا پرچار شروع کر دیا تھا اگرچہ بعض صوفیاء ابھی تک علم باطنی کے اسرار کا افشا کرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

جنید کا قول

چنانچہ جنید، شبلی پر طعن کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم نے اس علم کی تزیین و آرائش کی اور اس کے گیسوؤں کو سنوارا لیکن ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ ان اسرار سے پردہ نہ اٹھایا جائے لیکن آپ نے سب لوگوں کے سامنے تمام اسرار کو فاش کر دیا۔

شبلی کا قول

جنید کی بات کو ٹھکراتے ہوئے شبلی نے کہا،

انا اقول وانا	میں ہی باتیں کرتا ہوں، میں ہی سنتا ہوں دونوں
اسمع فهل فی الدارین غیری[1]	جہانوں میں میرے سوا کوئی نہیں۔

شبلی کا قول پتہ دے رہا ہے کہ وہ وحدت الوجود کا قائل ہے

اس کے بعد آہستہ آہستہ اس علم کے اسرار کو فاش کیا جاتا رہا جو درحقیقت صرف حلول و اتحاد کے نظریہ کا نام تھا یعنی تمام کائنات کو اللہ کی ذات میں فنا حاصل ہے۔ گویا کہ صرف اللہ ہی ہے اسی نظریہ کے حامل ہندوستان کے برہمن بھی تھے یہاں تک کہ تیسری صدی ہجری کے آخر اور چوتھی صدی کے آغاز میں وحدۃ الوجود کے نظریہ کو عام فروغ حاصل ہو چکا تھا چنانچہ اس نظریہ کے اثبات میں ہم چند صوفیاء کے اقوال پیش کرتے ہیں جن سے ان کے باطنی عقائد کا بھی پتہ چلتا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو تصوف کے فن میں اپنے دور کے صوفیاء پر گوئے سبقت

---

[1] التعرف علی مذہب التصوف ص ■ ۱۴)

لے گئے تھے۔ اور ان کی شہرت نے انہیں دوام بخش دیا تھا۔

ابوحمزہ صوفی کا نظریہ ابونصر سراج طوسی جو اللمع فی التصوف کے مؤلف ہیں وہ اس کتاب کے ص ۴۹۵ پر تحریر کرتے ہیں۔

کہ ابوحمزہ صوفی کا حارث محاسبی کے گھر جانے کا اتفاق ہوا وہاں حارث کی بکری نے جب مَیں مَیں کی آواز کی تو ابوحمزہ صوفی ہچکیاں لینے لگا اور بکری سے مخاطب ہو کر کہنے لگا (لبیک یا سیدی) (میرے آقا میں حاضر ہوں) اس پر حارث محاسبی نے اسے ٹوکا ابوحمزہ نے اس کا جواب دیا کہ تیرے انکار کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کے میدان میں ابھی تم مبتدی ہو یعنی تم ابھی تک وحدۃ الوجود کے نظریہ کی حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکے ہو۔

ابوالحسین نوری صوفی کا قول[۲] اس نے ایک کتے کو پایا کہ وہ بھونک رہا ہے۔ تو اس سے کہنے لگا (لبیک وسعدیک) میں حاضر ہوں میں حاضر ہوں یعنی نظریہ وحدۃ الوجود کے پیش نظر کتے کو خدا سمجھتے ہوئے اس کے بھونکنے کی آواز پر لبیک کہہ رہا ہے۔

شبلی صوفی کا واقعہ[۳] وہ اپنے معتقدین میں سے ایک سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتا ہے تم جہاں کہیں بھی رہو گے میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ اسی طرح تم بھی میری حفاظت اور میری نگرانی میں رہتے ہو مقصد وحدۃ الوجود کے نظریہ کا اظہار ہے۔

۱ے ڈاکٹر عبدالحلیم محمود اور طٰہٰ عبدالباقی سرور نے اس کتاب کی طبع و اشاعت کا اہتمام کیا۔

۲ے اللمع ص ۴۹۲) ۳ے اللمع ص ۴۸۷)

ان تمام صوفیاء میں سے جس نے کھل کر علم باطن کا پرچار کیا اور نہایت بیباکی کے ساتھ وحدت الوجود کی اشاعت کی وہ حلاج ہے ہم ذیل میں اس کی شخصیت اور اس کے افکار وغیرہ کا تفصیل سے ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

حلاج صوفی کی شخصیت

تیسری صدی ہجری کے آخر میں فارس میں نشوونما پائی کچھ عرصہ واسط عراق میں بھی گذرا جب سن شعور کو پہنچے تو سید الطائفۃ الصوفیہ جنید، ابوالحسین نوری، فوطی کی صحبت میں سلوک کی منزلیں طے کیں اور تصوف کی ایسی منزل پر متمکن ہوئے کہ بڑی بے باکی اور جرأت کے ساتھ علم باطن کی تبلیغ شروع کر دی جب کہ اس کے عہد کے دیگر صوفیاء جو اسی کے ہم عقیدہ تھے حجروں میں چھپ کر بیٹھے تھے اور زبان پر اس قسم کا کوئی کلمہ لانے کے لیے تیار نہ تھے۔ چنانچہ شبلی ان کا تعارف کراتے ہوئے کہتا ہے لہ

میں اور حلاج ایک ہی نظریہ کے حامل تھے اس نے اپنے نظریے کا اعلان کر دیا جب کہ میں نے اس کے چھپانے میں مصلحت سمجھی۔ حلاج کی متصوفانہ شخصیت کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے۔ کہ تصوف کے نظریات کو جن واضح الفاظ میں اس نے بیان کیا ہے۔ کوئی دوسرا اس کو بیان نہ کر سکا۔ چنانچہ حلاج کی کتاب الطواسین جسے مستشرق لوئیس ثنیون نے آڈٹ (AUDIT) کر کے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کے (طاسین الازل والالتباس) کے باب میں حلاج کہتا ہے۔ کہ اس دنیا میں ابلیس اور احمد کے علاوہ کسی کا دعویٰ صحیح ثابت نہیں ہوا ہے۔ البتہ ابلیس اپنی شخصیت کھو بیٹھا۔ اور احمد کو اپنی شخصیت نمایاں نظر آئی۔ جب ابلیس سے کہا گیا۔

لہ (الحلاج لطہٰ عبدالباقی سرور ص ۱۰۴)

سجدہ کر۔ تو اس نے سجدہ نہ کیا۔ اور جب احمد سے کہا گیا۔ دیکھ۔ تو اس نے دائیں اور بائیں نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ ابلیس نے دعویٰ کیا۔ اور اپنی طاقت پر نازاں رہا۔ احمد نے دعویٰ کیا لیکن اپنی طاقت کو کچھ حیثیت نہ دی۔ اور اللہ پاک سے دعا کرتے ہوئے یہ کلمات کہے۔ کہ تیری طاقت کے ساتھ میں کچھ کر سکتا ہوں۔ اور تیرے حملہ کے ساتھ میں حملہ کر سکتا ہوں۔ اور یہ کلمات بھی کہے کہ اے اللہ۔ تو دلوں کو پھیرنے والا ہے۔ اور یہ بھی کہا۔ کہ میں تیری تعریف نہیں کر سکتا۔ گویا کہ احمد نے اپنی ذات کو اللہ کی ذات میں سمو دیا۔ اسی لیے اپنی قوت اور طاقت پر بھروسہ نہیں کیا۔ اللہ کی قوت اور طاقت ہی کو اپنی طاقت قرار دیا ہے۔

ابلیس موحد تھا؟

اگر غور کیا جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں میں ابلیس جیسا کوئی موحد نہ تھا۔ جب اللہ نے اس سے کہا سجدہ کر تو ابلیس نے کہا۔ تیرا غیر نہیں ہے۔ اللہ نے کہا تجھ پر میری لعنت ہے۔ اس کے جواب میں بھی ابلیس نے کہا۔ بس تو ہی تو ہے۔ تیرا غیر نہیں ہے۔ مجھے تیرے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ تو ہی میرا محبوب ہے۔ اور میں تیری محبت میں ذلیل ہو چکا ہوں۔ اللہ نے فرمایا۔ تو نہ سجدہ کرنے کی وجہ سے متکبر بن گیا ہے۔ ابلیس نے کہا۔ اگر میرے سامنے کوئی دوسرا ہوتا تو تجھ سے نظر پھیر کر میں اس کو دیکھتا تو پھر میں متکبر تھا۔ اور میرا مقام تو یہ ہے کہ میں ازل سے تیرا خادم ہوں۔ اور تیری معرفت رکھتا ہوں۔ دونوں جہانوں میں مجھ سے زیادہ تیری معرفت رکھنے والا کوئی انسان نہیں ہے۔ پس کچھ شبہ نہ رہا کہ میں آدم سے بہتر ہوں۔ اور میں تیرا عاشق ہوں۔ تو میرا عاشق ہے۔ میں ازل سے تیرا مشتاق ہوں۔ میرا سجدہ تیرے غیر کے سامنے کیسے ہو سکتا ہے۔

پھر اگر میں نے سجدہ نہیں کیا ہے۔ تو میرے اصل اور خمیر کا یہی تقاضا تھا۔ اس لیے کہ تو نے مجھے آگ سے بنایا۔ اور آگ کا لوٹنا بھی آگ کی طرف ہی ہو گا۔ تمام معاملات تیرے ہاتھ میں ہیں۔ تو نے ہی تقدیر کو بنایا۔ اور تو نے ہی اختیار بخشا۔ میرے لحاظ سے قرب اور دوری میں فرق ہو سکتا ہے۔ لیکن تیرے نزدیک قرب اور بعد ایک ہی چیز ہے۔

مزید حلاج کہتا ہے۔ کوہ طور پر حضرت موسیٰ اور ابلیس کی ملاقات ہوئی۔ حضرت موسیٰ نے اس سے کہا۔ اے ابلیس۔ تو نے سجدہ کیوں نہ کیا۔ ابلیس نے جواب دیا۔ چونکہ میں ایک معبود کا قائل تھا۔ اس لیے سجدہ نہ کیا۔ اگر میں سجدہ کر لیتا۔ تو میں بھی تیرے جیسا بن جاتا۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ تجھے ایک بار پکارا گیا۔ کہ پہاڑ کی طرف دیکھو۔ تو نے پہاڑ کی طرف دیکھا اور مجھے ہزار بار بھی کہا جاتا کہ سجدہ کر۔ تو میں کبھی سجدہ نہ کرتا۔ حضرت موسیٰ نے جواب دیا۔ تو نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی۔ ابلیس نے کہا اس کا حکم نہیں تھا۔ آزمائش تھی۔ حضرت موسیٰ نے اس سے کہا۔ بہر آئینہ۔ اس نافرمانی پر تیری شخصیت پہلے جیسی نہ رہی۔ ابلیس نے جواب دیا اے موسیٰ یہ تمام باتیں تلبیسات ہیں۔ احوال کا ان پر انحصار نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میری معرفت صحیح تھی۔ اس لیے اس میں تبدیلی نہیں آئی۔ اور میں نے اللہ کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کیا۔ اگرچہ میرا تشخص برقرار نہیں رہا۔ اس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اب بھی تو اللہ کا ذکر کرتا ہے۔ جواب دیا اس کے ذکر میں مستغرق ہوں۔ نیز کہا اے موسیٰ میرا بھی ذکر ہوتا ہے۔ اور میرے اور اس کے

درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ اس کا ذکر میرا ذکر ہے۔ اور میرا ذکر اس کا ذکر ہے۔ اسی طرح تمام ذکر کرنے والے ایک وجود ہیں۔

نیز ابلیس نے کہا پہلے کی نسبت اب میرا خدمت کرنا زیادہ اچھے انداز سے ہے۔ اور میرے اوقات میں تخلیہ بھی زیادہ ہے اور میرے ذکر میں زیادہ سرور ہے اس لیے کہ پہلے تو میں اپنے مقاصد کے لیے اس کی خدمت کیا کرتا تھا۔ اور اب میرے سامنے صرف ذات واحد ہے اور اسی کی خدمت ہے اسی کے مقاصد ہیں۔ نیز حلاج نے کہا عزازیل یعنی ابلیس آسمانوں اور زمین دونوں میں داعی کی حیثیت رکھتا ہے۔ آسمانوں میں فرشتوں کو دعوت دیتا رہا انہیں ان کی خوبیوں سے آگاہ کرتا رہا اور زمین میں انسانوں کو دعوت دیتا رہا انہیں ان کی قباحتوں سے واقف کراتا رہا مشہور محاورہ کے مطابق اشیاء کی معرفت ان کے اضداد سے ہوتی ہے۔

یہ تھے وہ باطنی نظریات اور متصوفانہ تلبیسات جنہوں نے حلاج کی شخصیت کو مجروح بنا دیا تھا۔ چنانچہ ان ملحدانہ افکار اور کافرانہ نظریات نے (جن کو انہوں نے بانگ دہل بیان کیا اور وحدت الوجود کے نظریہ کو شدومد کے ساتھ عام محفلوں میں بیان کیا) ان کے مخالفین کو مجبور کر دیا کہ اس قسم کے انسان کا زندہ رہنا مسئلہ توحید کے بقا کے پیش نظر جائز نہیں۔ اس بنا پر ۶ ذی القعدہ بروز منگل وار ۳۰۹ھ میں اسے بغداد میں تختہ دار پر لٹکایا گیا۔

حلاج کا قتل اور دیگر صوفیاء

اگرچہ بعض صوفیاء نے اس کے قتل کے بعد اپنی جان کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے

اس کے خلاف بیان دیا۔ تاہم اکثر صوفیاء نظریہ وحدت الوجود میں اس کے ساتھ متفق تھے لیکن انہوں نے اس کا نام ذکر کیے بغیر اس کے اقوال کو اپنی تالیفات میں ذکر کیا چوتھی صدی ہجری کے مشہور صوفی ابوبکر محمد کلاباذی المتوفی ۳۸۰ھ نے اپنی تالیف (التعرف علی مذہب اہل التصوف) میں ابونصر السراج الطوسی المتوفی ۳۷۸ھ نے اپنی تالیف (اللمع) میں حلاج کے اقوال کا اس کا نام لیے بغیر پچاس مقامات میں ذکر کیا ہے[1] اور بعض صوفیاء نے اس کی تعریف میں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ محمد ابن خفیف نے اس کا ذکر کرتے ہوئے اسے عالم ربانی کے خطاب سے نوازا ہے[2]

البتہ پانچویں صدی ہجری اور چھٹی کے اوائل میں صوفیاء نے حلاج کے اقوال کو اس کی جانب منسوب کر کے ذکر کرنا شروع کیا اور اس کے علم و فضل اور وسعت ظرف کی داد دینے لگے ابو حامد غزالی ابن عربی، عبدالغنی نابلسی نیز پانچویں صدی کے دیگر صوفیا کی کتابوں میں ان کا بڑے ادب و احترام کے ساتھ ذکر موجود ہے۔

موجودہ دور میں بھی طٰہٰ عبدالباقی سرور نے (الحلاج شہید التصوف الاسلامی) کے عنوان سے کتاب تحریر کر کے انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے جس میں ان کو دین اسلام کا داعی، مصلح انقلابی لیڈر کے القاب سے نوازا گیا ہے۔

حلاج کے باطنی نظریات کا تجزیہ

حلاج کی متصوفانہ شخصیت کے بیان کے ضمن میں اس کے اقوال وغیرہ سے

---

[1] مقدمہ کتاب الحلاج ص ۱۱ [2] طبقات الصوفیہ ۳۰۸)

صوفیاء کے عقائد باطنیہ سے کسی حد تک واقفیت حاصل ہوئی ہے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اختصار کے ساتھ ان باطنی نظریات کا تجزیہ کیا جائے تاکہ الحاد و زندیقیت کے خفیہ حملوں سے تحفظ حاصل ہو سکے۔

اولاً: حلاج کی اسلام دشمنی اور بدبختی کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ کے دشمن ابلیس کو ایک حکم میں شریک کر رہا ہے۔ پھر ابلیس کو مجرم نہیں سمجھتا ہے۔ پھر اس پر استدلال کرتے ہوئے کہتا ہے۔ کہ ابلیس کا نہ سجدہ کرنا مشیئت ایزدی کے تابع ہے۔ گویا کہ اللہ کی قدرت کے سامنے وہ محض مجبور ہے۔ ثابت ہوا کہ موجود صرف اللہ ہے۔ اور جب اللہ کے سوا کچھ موجود نہیں تو قرب، بعد میں کچھ فرق نہیں پھر کس قدر دجل و فریب کی قسوں کاری ہے کہ ابلیس کو آسمانوں پر نیکیوں کی جانب اور زمین میں برائیوں کی جانب دعوت دینے والا ثابت کیا ہے۔ پھر اسکو مجبور محض ثابت کر کے اللہ کی مشیئت کے تابع کر کے اس کو نافرمانوں کی فہرست سے نکال دیا ہے۔

ثانیاً: جس طرح ابلیس نے سجدہ نہ کیا اس لیے کہ وہ وحدۃ الوجود کا قائل تھا۔ اس کے سامنے اللہ کے سوا کچھ ہوتا تو وہ اس کو سجدہ کرتا اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ آپ دیکھیں لیکن آپ نے نہ دیکھا اس لیے کہ آپؐ بھی وحدۃ الوجود کے قائل تھے اگر اللہ کے ماسوی کچھ ہوتا تو آپ دیکھتے اس لیے کہ آپ ہی تو اللہ تھے اور تمام کائنات اللہ ہے؟

چنانچہ اس معنی کی تائید میں (ما زاغ البصر وما طغیٰ) آیت پیش کی ہے۔ پس وحدۃ الوجود کے نظریہ کے لحاظ سے ابلیس اور رسول اکرم ایک لڑی میں منسلک ہیں معاذ اللہ

دراصل اس قسم کی باتیں صوفیاء کی تلبیسات سے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ درج ذیل آیت حضرت جبریل علیہ السلام کا مشاہدہ کرنے کے بارے میں ہے کہ آپ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو اس کی اصل حالت میں دیکھا تھا۔ آپ کے مشاہدہ کرنے میں آپ کی نظر کسی اور طرف مائل نہیں ہوئی اور نہ اس نے تجاوز کیا۔ اللہ کے مشاہدہ کرنے میں نہیں ہے۔ پھر آپ پر الزام لگانا کہ آپ بھی وحدۃ الوجود کے قائل تھے بہت بڑی دیدہ دلیری اور تکبر اس ہے۔

ثالثاً: حلاج کا یہ قول کہ رسول اکرمؐ کا دعا کرنا (میں تیرے ساتھ حملہ کرتا ہوں اور تیرے ساتھ میری قوت ہے اور تیرے ساتھ میرا کلام کرنا ہے[1]) اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ آپ اپنے آپ کو اللہ کی مشیئت کے تابع اور محض مجبور سمجھتے ہیں اور وحدۃ الوجود کے قائل ہیں۔

خیال رہے حلاج نے حدیث کا مفہوم اپنے خبیث عقیدے کے مطابق بنا لیا ہے۔ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کو اللہ کے ساتھ اس طرح استوار کر دیا ہے کہ آپ ہی اللہ ہیں۔ حالانکہ حدیث کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص میں اللہ کی توفیق کے بغیر نیکی کرنے کی طاقت نہیں۔ چنانچہ آپؐ کا مشہور فرمان لاحول ولا قوۃ الا باللہ کا بھی یہی معنیٰ ہے کہ اللہ کی قدرت اور مشیئت کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم مجبور محض ہیں۔ جہاں ہم تقدیر کے تابع ہیں۔ وہاں ہمیں اختیار بھی دیا گیا ہے۔

---

[1] (میرا کلام کرنا ہے) یہ جملہ صحیح حدیث میں نہیں ہے۔ دیکھئے سنن ابوداؤد ۲۶۳۲) الاستاذ علامہ البانی نے (تخریج الکلام الطیب ص ۸۵ میں سند کو صحیح کہا ہے۔ ترمذی میں اختصار کے ساتھ ہے ۲/۲۷۸) مسند احمد ۱۶/۶)

رابعاً: حلاج کے مذکورہ اقوال میں نہ صرف یہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ناقدانہ حملے کیے ہیں۔ اور آپ کو اور شیطان کو ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ بلکہ دوسرے پیغمبروں کو بھی معاف نہیں کیا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے بارے میں ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اسے اللہ کی حقیقی معرفت حاصل نہیں تھی حلاج کا مقصد یہ نظر آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نظریہ وحدت الوجود پر قائم نہ تھے یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے اپنے رب سے دعا کی۔ رب ارنی انظر الیک۔ اے میرے پروردگار تو مجھے اپنی ذات کا مشاہدہ کرا۔ میں تیری ذات کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ بقول حلاج کے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معرفت حاصل ہوتی تو وہ یہ مطالبہ نہ کرتے۔ جب کہ نظریہ وحدت الوجود کے لحاظ سے تمام کائنات خدا ہے اور خود حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی خدا ہے۔ تو پھر دیکھنے کا مطالبہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

مقامِ فتوت

حلاج نے جس بیباکی سے اپنے غلط عقیدے کو پھیلانے میں تگ و دو کی ہے۔ اور اشارات کنایات سے آگے گزر کر صراحتاً اپنے باطنی نظریات کا پرچار کیا ہے۔ اس کے پیشِ نظر صوفیا نے حلاج کو مقامِ فتوت پر فائز کر دیا ہے۔

ایک واقعہ[1]

حلاج خود بیان کرتا ہے کہ فتوت کے بارے میں میرا ابلیس اور فرعون کے ساتھ مناظرہ ہوا۔ ابلیس نے کہا اگر میں سجدہ کر لیتا تو مجھ سے فتوت کا مقام چھن جاتا فرعون نے کہا کہ اگر میں اللہ کے فرستادہ رسول حضرت موسیٰ علیہ السّلام پر ایمان لے آتا تو میں فتوت

---

[1] الطواسین ص ۵۲

کی منزل سے نیچے گر پڑتا۔ میں نے کہا۔ اگر میں وحدت الوجود کے نظریہ سے دست بردار ہو جاؤں۔ تو میں مقام فتوت سے نیچے گرا دیا جاؤں گا۔

پھر ابلیس نے کہا۔ میں نے نہ سجدہ کرنے کی دلیل پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں آدم سے بہتر ہوں۔ اس کی بنیاد دراصل یہ تھی کہ میرا غیر موجود نہیں ہے (وحدت الوجود) کے نظریہ کا یہی نتیجہ ہے۔ اور فرعون نے کہا کہ میرے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسے قوم میں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا تھا۔ جو حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے کی صلاحیتوں سے موصوف ہو۔ اور میں نے کہا کہ اگر تمہیں اللہ کی معرفت حاصل نہیں ہو سکی ہے تو اس کے آثار کی معرفت حاصل کرو۔ اور مجھے اس کا اثر سمجھو۔ اور مجھے خدا سمجھو۔ اس لیے کہ میں ہمیشہ سے خدا کے ساتھ خدا کی حیثیت میں رہا ہوں۔ پھر حلاج ذرا تند و تیز لہجہ میں کہنے لگا۔ کہ میرا استاد ابلیس اور میرا رفیق فرعون ہیں۔ ابلیس کو دوزخ کی دھمکی دی گئی۔ لیکن وہ اپنے دعوی سے باز نہ آیا۔ اور فرعون کو دریا میں غرق کیا گیا۔ وہ بھی اپنے دعوی سے تائب نہ ہوا۔ اور اس نے بھی اللہ کے غیر کا اقرار نہ کیا۔

اور میرا یہ حال ہے کہ اگرچہ مجھے تختہ دار پر لٹکا دیا جائے، میری لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں مجھے موت کی نیند سُلا دیا جائے یا میرے ہاتھوں اور پاؤں کو کاٹ کر الگ کر دیا جائے۔ تب بھی میں وحدت الوجود کے نظریہ سے توبہ نہیں کروں گا۔ حلاج کا یہ نظریہ صرف ایک فرد کا نہیں ہے۔ بلکہ اس کے معاصرین میں سے اکثر صوفیاء کا یہی نظریہ ہے۔ البتہ انہوں نے اس قدر واضح اور واشگاف الفاظ میں اس کا پرچار نہ کیا۔

(اس حکایت سے مقصود یہ ہے کہ جنید، شبلی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ جب وہ اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دے گا اور اللہ کی رضا پر راضی رہے گا۔ اور اپنے اختیار کو معدوم سمجھے گا تو راحت اور سکون سے ہمکنار ہو گا۔ اس کے جواب میں شبلی نے اگرچہ بظاہر اس کے متضاد جملہ استعمال کیا ہے لیکن درحقیقت مفہوم وہی ہے۔ چنانچہ شبلی کہتا ہے کہ بندہ اللہ کے سامنے مجبور محض ہے۔ اسے قطعاً کچھ اختیار حاصل نہیں ہے تمام معاملات کی باگ ڈور اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

لیکن اگر تمام امور کا اختیار بندے کو دے دیا جاتا تو اسے راحت نصیب ہوتی اور وہ جس چیز کا قصد کرتا اسے اختیار کر لیتا بظاہر دونوں عبارتیں متضاد ہیں لیکن حقیقتاً ان کا مفہوم ایک ہے لیکن شبلی کی عبارت بہ نسبت جنید کی عبارت کے مفہوم پر زیادہ دلالت کر رہی ہے۔ اس لیے جنید نے شبلی سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ کی تلوار خون کی ندیاں بہا دے گی۔

صوفیاء کے ہاں انسان مجبور محض ہے

جب حلاج کو تختہ دار پر لٹکانے کے لیے لایا گیا اس کا قصور یہی تھا کہ وہ وحدت الوجود کا قائل تھا اور انسان کو مجبور محض سمجھتا تھا۔ تو اس دور کے صوفیاء کو اکٹھا کیا گیا انہوں نے مجبور ہو کر حلاج کو برا بھلا کہا ان میں حلاج کے نظریہ کے حامل شبلی بھی تھے اگرچہ شبلی رضا و رغبت کے ساتھ آنے کے لیے تیار نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے گلے میں پھندا ڈال کر انہیں کھینچ کر لایا گیا کہ وہ حلاج پر لعنت بھیجے لیکن اس نے انکار کیا سپاہیوں نے اسے کہا کہ خود جا کر لعنت بھیجو یا اپنے کسی رفیق کو بھیجو کہ وہ حلاج پر لعنت کرے۔ اس حکم کی تعمیل

کرتے ہوئے اس نے ایک متصوفہ عورت کو بھیجا۔ اور اس نے اسے کہا کہ وہ حلاج کے پاس جاکر کہے کہ اللہ نے تجھے ایک راز کی بات پر امین بنایا تھا لیکن تو نے اس کو فاش کر دیا اب اس جرم کی سزا میں تلوار کی دھار کا مزہ چکھو۔ (ماسینون منشورات الصوفیہ)

ان تمام واقعات سے معلوم ہوا کہ تیسری صدی ہجری میں متصوفین باطنی نظریات پر متحد تھے۔ ان میں اختلاف نہ تھا البتہ ان کے اظہار میں وہ مختلف الحال تھے۔

باطنی علم کیوں کر حاصل ہو سکتا ہے اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ باطنی علم تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ نفس کی اصلاح کی جائے اللہ کے ذکر اور تسبیح، تحمید پر مداومت اختیار کی جائے اور پرہیزگاری جیسے وصف سے موصوف ہوا جائے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے اپنی زندگی کو اس طرح شریعت اسلامیہ کا پابند بنایا اور تسبیح، تحمید، ذکر و اذکار میں منہمک رہے۔ اس کے باوجود انہیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اور وہ باطنی علم کی نعمت کے حصول سے ہمکنار نہ ہو سکے معلوم ہوا کہ یہ نظریہ غلط ہے۔

امام غزالی کی حکایت[1] چنانچہ اس میدان میں ناکام ہونے والوں میں سے ایک ناکام انسان کی حکایت بیان کرتے ہوئے امام غزالی کہتے ہیں۔

بسطام میں ایک عظیم المرتبت متشرع پرہیزگار انسان رہتے تھے۔ وہ ہمیشہ

---

[1] الاحیاء جلد ۳ صفحہ ۳۵۸

ابو یزید لبسطامی کی مجلس میں حاضر ہوتے ایک روز اس نے ابو یزید لبسطامی سے شکوہ کرتے ہوئے کہا میں تیس سال سے آپ کی صحبت میں رہ رہا ہوں اس عرصہ میں کبھی رات کو سویا نہیں قیام کرتا رہا اور ہمیشہ روزے رکھتا رہا کبھی ایک دن بھی افطار نہیں کیا۔ لیکن میرے دل میں باطنی علم کے کچھ اثرات نظر نہیں آتے ہیں۔ حالانکہ میں باطنی علم کا قائل ہوں۔ اور اس کو صحیح سمجھتا ہوں۔ ابو یزید لبسطامی نے کہا اگر میں مسلسل تین سو سال تک دن کو روزہ رکھو اور رات بھر قیام کرتے رہو تو تجھے اس علم کا ایک قطرہ بھی حاصل نہیں ہو گا۔ اس نے دریافت کیا کیوں۔ ابو یزید لبسطامی نے جواب دیا۔ اسلئے کہ تیرا دل پردوں میں ہے۔ اس نے پوچھا کیا اس کا کوئی علاج بھی ہے اس نے کہا۔ ہاں مجھے بتائیں تاکہ میں اس پر عمل کروں اس نے کہا تم وہ علاج نہیں کر سکو گے اس نے دوبارہ کہا آپ بتائیں تو سہی میں اس پر عمل کروں گا ابو یزید لبسطامی نے کہا آپ سیدھے حجام کے پاس جائیں اور اپنا سر ڈاڑھی منڈوا دیں۔ اور اس لباس کو جو آپ نے پہنا ہوا ہے۔ اتار دیں۔ گودڑی پہنیں۔ اور گردن میں ایک کشکول لٹکائیں۔ جو باداموں سے بھرا ہوا ہو پھر اپنے گرد بچوں کو جمع کرو۔ اور ان سے کہو جو مجھے گھونسا مارے گا میں اسے ایک بادام دوں گا۔ اسی حالت میں گلی گلی پھرو اور کچھ خیال نہ کرو کہ اس حالت میں جہاں تم پھر رہے ہو۔ وہ لوگ تمہیں پہچانتے ہیں کہ وہ کیا کہیں گے۔ ان باتوں کو سن کر اس نے کہا۔ سُبحان اللہ تعجب ہے آپ مجھ سے کیسی باتیں کہہ رہے ہیں۔ ابو یزید لبسطامی نے کہا تیرا سُبحان اللہ کہنا بھی شرک ہے۔ اس نے پوچھا کس لیے اس نے جواب دیا۔ اس لیے کہ جب تو نے سُبحان اللہ کہا ہے تو اپنے آپ کو بلند سمجھ کر یہ کلمہ کہا ہے۔

حقیقتاً تو نے اپنے پروردگار کی پاکیزگی بیان کرتے ہوئے یہ کلمہ نہیں کہا۔

بلکہ اپنی پاکیزگی بیان کرتے ہوئے یہ کلمہ کہا ہے۔ اس لیے یہ کلمہ شرک ہے۔ اس نے کہا جو بھی ہے۔ بہر حال یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ کوئی دوسرا علاج بتلایئے۔

ابو یزید بسطامی نے کہا۔ بس پہلا علاج تو یہی تھا۔ اگر تو یہ نہیں کر سکتا۔ تو باقی علاج کیسے کر سکتا ہے۔ اس نے کہا۔ اس کی تو مجھ میں طاقت نہیں۔ ابو یزید بسطامی نے کہا۔ میں نے تو تجھے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ کہ تجھ میں اس علم کے حصول کی صلاحیتیں نہیں ہیں۔ تعجب خیز بات یہ ہے۔ کہ امام غزالی اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ جس شخص کا دل بیمار ہے۔ اور وہ اس کے نفس کے تابع ہے۔ اس کا علاج ہے۔ جس کا ابو یزید بسطامی نے ذکر کیا ہے۔ کیا آپ غور نہیں کرتے ہیں۔ کہ مذکورہ واقعہ میں صالح متدین انسان عمر بھر نہ کبھی روزہ چھوڑتا ہے۔ اور نہ کبھی رات کو سوتا ہے۔

چونکہ وہ انسان علم باطنی کے زیور سے آراستہ نہیں ہے۔ اس لیے نہ اس پر القاء ہو گا۔ اور نہ اسے کسی ہاتف کی آواز آئے گی۔ جب وہ بھی غیبی آوازوں سے محروم رہا۔ تو اس نے ابو یزید بسطامی سے پریشانی کے عالم میں شکوہ کیا۔ ابو یزید بسطامی نے اسے خیر خواہانہ انداز میں سمجھایا۔ کہ تیرا یوں عبادت کرنا تیرے حجابات کو دور نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ ہماری ہدایت پر نہ چلے۔ لیکن اس حالت میں کہ آپ اللہ پاک کی عبادت میں محو ہیں۔ آپ کی غلطی یہ ہے کہ آپ کے قلب و ذہن میں یہ خیال بار بار آتا ہے کہ آپ اللہ کی عبادت کر رہے ہیں۔

حالانکہ صوفیاء کا نظریہ یہ ہے کہ ہر شخص یہ اعتقاد رکھے۔ کہ میری کچھ حیثیت نہیں۔ بس اللہ نے مجھے اس سعادت سے ہمکنار کیا ہے۔ اور میرا اس کام کے لیے

انتخاب کرلیا ہے۔ ورنہ میرے ارادے کا اس میں کچھ دخل نہیں ہے۔ جب اللہ کا ارادہ ہوتا ہے۔ تو میں عبادت میں مصروف ہوجاتا ہوں۔ بلکہ اس کے بالمقابل یہ نظریہ رکھنا بھی ضروری ہے۔ کہ اللہ کے ارادے سے ہی نافرمان نافرمانیاں کر رہے ہیں۔

اسی طرح کفّار کے کُفر میں بھی اس کا ارادہ دخیل ہے۔ یہاں تک کہ حلاج کی طرف سے جن واقعات کا ذکر سابقہ اوراق میں ہوچکا ہے۔ وہ تو ابلیس کو ابلیس کے گمراہ ہونے میں اللہ کے ارادے کو شریک ٹھہراتا ہے۔ جس طرح کہ سابقہ حکایت میں ابویزید بسطامی نے اس آدمی سے کہا کہ سبحان اللہ شرک ہے۔ جس آدمی نے اس کی تجویز کو ٹھکراتے ہوئے اور اپنی حیثیت کو اونچا دکھاتے ہوئے سبحان اللہ کہا تھا ظاہر ہے کہ اس نے اس برے فعل سے اپنے آپ کو پاکیزہ قرار دیا۔ لیکن اللہ پاک کو پاکیزہ قرار نہ دیا۔ حالانکہ انسان کے تمام افعال میں اللہ کے ارادے کو دخل ہے۔

دراصل ابویزید بسطامی چاہتے تھے۔ کہ یہ شخص تصوف کی حقیقت سے شناسا ہوجائے۔ اور اس قسم کے مجاہدہ سے یقیناً وہ کامیابی سے ہمکنار ہوگا۔ اور لیکن جب وہ اپنے دل و دماغ میں اس عقیدے کو سمو دے گا۔ کہ جو کچھ کائنات میں ہو رہا ہے۔ اللہ کی مشیئت کے تابع ہے۔ پس نیک کام کرنے والے اور برائی کا ارتکاب کرنے والے سبھی اس کے ارادے اور مشیت کے تابع ہیں۔

مسئلہ تقدیر اور صوفیاء

بظاہر مسئلہ تقدیر خاصا مشکل دکھائی دیتا ہے لیکن کتاب و سُنّت کی روشنی میں اس مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

تو تمام الجھاؤ ختم ہو جاتے ہیں۔ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ تمام لوگ یہ سمجھیں کہ تمام کائنات میں جو تصرّف ہو رہا ہے۔ وہ اللہ کے ازلی علم کے تابع ہے۔ اللہ پاک کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ وہ مستقبل کا علم رکھتا ہے۔ لیکن اللہ کسی کو کسی فعل پر مجبور نہیں کرتا۔ اور تمام انسانوں کو اختیار دیا گیا ہے۔ اور ان پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اسی اختیار کی بنا پر ہی تو انسان شریعت کا مکلّف ہے۔ اور اسی کا اس سے حساب لیا جائے گا۔

پس انسان کو مجبور محض سمجھنا غلط ہے۔ اور انسان کی حرکات کو اللہ کے علم کے تابع نہ سمجھنا یہ بھی غلط ہے۔ اور انسان کے اختیار ارادے کو نہ ماننا یہ بھی غلط ہے۔ اگر ہم نیک کام کر رہے ہیں۔ تو اس کی توفیق اور ہدایت ہمارے شاملِ حال ہے۔ اور اگر ہم نافرمانی کر رہے ہیں۔ تو اس میں بھی اس کا علم اور اس کی مشیت موجود ہے۔ اگرچہ اللہ کی طرف سے جبر موجود نہیں ہے۔ جب آسمان زمین میں اللہ کی بادشاہت ہے تو کیسے ممکن ہے کہ اس کی بادشاہت میں کوئی کام اس کی اجازت کے بغیر ہو جائے۔ اسی لیے تو ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ اللہ اگر چاہتے۔ تو اس بات پر قادر تھے۔ کہ کافر انسان کو کفر کرنے سے باز رکھے لیکن اس کا نہ روکنا اس کی طرف سے آزمائش ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے۔

ولو شاء ربك لآمن من في الارض كلهم جميعا [1]	اگر تیرا پروردگار چاہتا۔ تو زمین میں رہنے والے تمام کے تمام ایمان لے آتے۔

---

[1] یونس ۹۹

لیکن دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ پاک سیدھے راہ کی توفیق اس انسان کو دیتے ہیں۔ جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے۔

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سُبُلنا	اور جن لوگوں نے ہمارے راہ میں جہاد کیا ہم انہیں اپنے راہوں کی ہدایت بخش دیتے ہیں۔

نیز فرمایا:

فاما من اعطیٰ واتقیٰ وصدق بالحسنیٰ فسنیسرہ للیسریٰ	تو جس نے (خدا کے راستے میں مال) دیا۔ اور پرہیزگاری کی۔ اور نیک بات کو سچ جانا اس کو ہم آسان طریقے کی توفیق دیں گے۔

اور جو لوگ اللہ کی ہدایت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ تو وہ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ گویا کہ گمراہی ان کی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم	تو جب ان لوگوں نے کجروی کی۔ خدا نے بھی ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے۔

نیز فرمایا:

ونقلب افئدتھم وابصارھم کما لم یؤمنوا بہ اول مرۃ	اور ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو الٹ دیں گے (تو) جیسے یہ اس (قرآن) پر پہلی دفعہ ایمان نہیں لائے (ویسے پھر نہ لائیں گے)

نیز فرمایا:

ومن یعش عن ذکر الرحمٰن نقیض	اور جو کوئی خدا کی یاد سے آنکھیں بند کر لے (یعنی

لہٗ شیطٰنًا فھو لہٗ قرین	تغافل کرے) ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں۔ تو وہ اس کا ساتھی ہو جاتا ہے۔

نیز فرمایا:

فبما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم	اور جو مصیبت تم پر واقع ہوتی ہے۔ سو تمہارے اپنے فعلوں سے ہے۔

ان تمام آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ابتدا میں کسی انسان کو شر میں نہیں ڈالتے۔ البتہ جب وہ کسی برائی کا مرتکب ہوتا ہے۔ تو بطور سزا کے اسے شر میں گرفتار کرتے ہیں۔ —— تعالیٰ ربنا عن ذالک علوًا کبیرا

معلوم ہوتا ہے۔ کہ صوفیاء تقدیر کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ ورنہ کیسے ممکن ہے کہ ان کی زبانوں سے اس قسم کے کلمات نکلیں۔ کہ ہر قسم کی معصیت اور برائی اللہ کے ارادے سے ہوتی ہے۔ اور اس کی رضا بھی اس میں شامل ہے۔ ان لوگوں نے اللہ پر افترا باندھا۔ اور اس قسم کے گستاخانہ اور اللہ کی ناراضگی کے کلمات کہہ دیئے۔ حالانکہ اللہ کی بادشاہت میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس میں اللہ کے ارادے کو حذف نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی اللہ کا ارادہ نہ ہو۔ لیکن برائی کرنے والے از خود برائی کرتے پھریں۔ نیز اللہ ان کو روکنے سے بھی عاجز ہو۔ ہمارا رب ان نقائص سے پاک ہے۔ پس ہم ان کاموں میں اللہ کی مشیت اور اس کے ارادے کو شریک سمجھتے ہیں۔ اس کے باوجود نافرمانی کرنے والے دنیا اور آخرت میں عقوبت خداوندی کے مستحق ہیں۔ اور جب وہ اللہ کی نافرمانیوں سے باز نہیں آتے ہیں۔ تو وہ اس لائق ہیں کہ ان کی مذمت کی جائے۔ انہیں ملعون کیا جائے۔ اور انہیں غضب آلود نگاہوں سے

دیکھا جائے معلوم ہوتا ہے۔ کہ شر کی نسبت اللہ کی جانب نہ کی جائے۔

جیساکہ صحیح حدیث میں ہے۔

والشر لیس الیک[1] | اور شر کی نسبت تیری طرف نہیں ہو سکتی۔

صوفیاء جب مسئلہ تقدیر کی شرعی حقیقت معلوم کرنے سے قاصر رہے تو انہوں نے کھلے لفظوں میں اعلان کر دیا کہ کفار، فجار کا فعل نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ارادے کے موافق ہے بلکہ وہ اس پر راضی ہے بلکہ حلاج نے تو ابلیس اور فرعون کے متعلق بھی کہہ دیا کہ وہ بھی اللہ کے ارادے کے تابع ہیں۔ ان کے فعل میں ان کو دخل نہیں ہے اسی لیے تو ابلیس نے سجدہ نہ کیا اور فرعون ایمان نہ لایا البتہ اس نے اپنے آپ کو خدا قرار دیا۔ اور پھر اس قول سے رجوع نہ کیا لہذا ان کے افعال اللہ کے حکم کے تابع ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ صوفیاء جب مسئلے قضا و قدر کی حقیقت معلوم نہ کر سکے تو اس قسم کے باطل فرسودہ نظریات کے قائل ہو گئے۔ اور ان کے عقائد میں یہ خیال مضبوط ہوتا چلا گیا کہ ہمارے علم و فہم کا استناد کشف پر ہے اور ہمارے دلوں پر علم لدنی[2] کا فیضان ہوتا ہے اور بلا واسطہ ہم وحی الٰہی سے روشنی حاصل کرتے ہیں یہ نظریہ ارتقاء کے منازل طے کرتا رہا۔ یہاں تک کہ متقدمین صوفیاء نے باطنی علم کی

---

[1] مسلم ۱/۶ ۵۷-۵۹ (مسلم کی حدیث کا جملہ ہے) ابوداؤد ۱/۶۷ مسند احمد وغیرہ نماز کی دعائے استفتاح کا ایک جملہ ہے۔ [2] حضرت خضر علیہ السلام کے قول (وعلمناہ من لدنا علما) میں لدنا کی طرف نسبت کرتے ہوئے اس کا نام علم لدنی رکھا گیا۔ جس کا معنی فیضان کا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے دلوں پر دنیا و آخرت کے حقائق منکشف ہوتے ہیں اور علم غیب سے آگاہی ہوتی ہے۔

بنیاد اسی نظریہ کو قرار دیا ان میں سے بعض دلیر قسم کے صوفیاء نے کھلے لفظوں میں اعلان کر دیا کہ علم شریعت جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوا وہ عام لوگوں کی شریعت ہے اور باطنی علم خاص لوگوں کی شریعت ہے جن کے دلوں سے حجابات زائل ہو چکے ہیں اور وہ بلا واسطہ اللہ سے علوم کی تلقی کرتے ہیں لیکن متاخرین صوفیاء نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ وہ اس میں غلو اختیار کر گئے اور عام طور پر کہنے لگے کہ شریعت اور اس کے ظواہر پر عمل کرنے والا آخرت میں نجات نہیں پا سکے گا۔

وہ درحقیقت دین اسلام کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں لہٰذا ان میں اور کافروں میں کچھ فرق نہیں جب کہ دین اسلام باطنی علم کا نام ہے اور علم شریعت اس کا مقدمہ تو کہلا سکتا ہے اسے منزل نہیں کہا جا سکتا۔

شیخ عبدالغنی نابلسی کا قول

دمشق میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما پائی وہیں ۱۱۴۳ھ میں فوت ہوئے۔ متاخرین علماء میں اونچے مقام پر فائز ہیں انہوں نے علم شریعت، تصوف، ادب میں بہت سی کتابیں تصنیف فرمائیں وہ الفتح الربانی والفیض الرحمانی ص ۱۳۳ میں رقمطراز ہیں۔

جو شخص شریعت کے ظاہری امور میں مشغولیت اختیار کرتا ہے لیکن اس کے حقائق اور باطنی علم سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ حالانکہ مقصود علم باطنی ہے۔ اسی پر نجات کا دار و مدار ہے۔ تو وہ انسان اللہ سے غافل ہے اور دین اسلام سے اس کا کچھ لگاؤ نہیں اس قسم کے لوگوں کے بارے میں ارشادِ ربّانی ہے

یعلمون ظاھرًا من الحیٰوۃ الدنیا وھم عن الاٰخرۃ ھم غافلون	یہ تو دنیا کی ظاہری زندگی کو جانتے ہیں۔ اور آخرت (کی طرف) سے غافل ہیں۔

شیخ نابلسی سابقہ آیات سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ علوم شریعت فقہ، حدیث، تفسیر کا علم ظاہری دنیوی زندگی کا علم ہے۔ اور باطنی علم سے روگردانی کر آخرت کے حقائق اور ان کے مزخرفات سے اعراض کرنا ہے۔

شیخ نابلسی کا علم شریعت سے اعراض

شیخ عبدالغنی نابلسی الفتح الربانی کے مقدمہ میں اقرار کرتے ہیں۔ کہ یہ کتاب وحی الہام کشف بلاواسطہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء وغیرہ کا مجموعہ ہے۔ کتاب میں آگے چل کر گناہ کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔ کہ اصل گناہ یہ ہے کہ انسان ان حقائق اور باطنی علوم سے ناآشنا رہے۔ جن کا شریعت میں اشارۃً ذکر ہے۔ اگر وہ علوم شریعت سے واقف نہیں ہے۔ تو اس کا کچھ حرج نہیں۔ اس لیئے کہ آخرت میں نجات کا انحصار علم شریعت پر نہیں ہے۔ اور انسان کا اپنے وجود کو اللہ سے الگ قرار دینا گناہ ہے گو کہ وحدۃ الوجود کا انکار کرنا گناہ ہے اس لحاظ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ ہیں اور تمام انسان بھی خدا ہیں۔ بلکہ تمام کائنات خدا ہے۔ ذیل میں ہم نابلسی کی اصل عبارت پیش کر رہے ہیں۔ تاکہ ہر قسم کا شک وشبہ دور ہو جائے اور ہم بدگمانی سے بچ سکیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

ما ثم الا ذات وصفات وصفات صفات وھی الافعال ومنفعلات وھی العالم فالاول ھو المعبود والثانی الموصل الیہ وھو الواسطۃ والثالث ھو العابد والرابع ھو العائق والمانع

وہاں صرف ذات اور صفات ہیں اور صفات کی صفات ہیں اور وہ افعال ہیں اور جہاں افعال کا محل ہے پس ذات سے مراد معبود ہے اور جس کی وساطت سے افعال پہنچتے ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور عابد سے مراد مومن لوگ ہیں۔ جو اللہ کی عبادت میں مشغول

والاول مرتبۃ اللّٰہ تعالیٰ والثانی مرتبۃ محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم والثالث مرتبۃ المؤمنین والرابع مرتبۃ الشیطٰن وھذہ الاربعۃ فی الحقیقۃ شیٔ واحد لکنہ تنزل وتفصل فظھرت ھذہ الاطوار وتعددت وجوداتہ [۱]

رہتے ہیں اور عبادت میں رکاوٹ ڈالنے والا شیطان ہے لیکن درحقیقت یہ چاروں ایک ہیں البتہ جب ان کو الگ الگ کیا جاتا ہے اور ان کے اپنے اپنے وجود کی شکل میں انہیں دیکھا جاتا ہے تو ان میں تعدد نظر آتا ہے اور مختلف شکلوں میں دکھائی دیتے ہیں۔

اس عبارت سے نظریۂ وحدت الوجود کی وضاحت ہو رہی ہے اور یہی نظریہ ان کے استاذ ابن عربی کا بھی ہے۔ ان کے ہاں اللہ کے سوا کسی کا وجود نہیں ہے۔ اور اللہ کے سوا جن چیزوں کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں وہ اس کے صفات ہیں۔ اور ان کا تنوع، تعدد صفات کے تعدد پر دلالت کر رہا ہے۔ تعالی اللہ عن ذلک علوا کبیرا

وھو حسبنا ونعم الوکیل

پس نابلسی کے ہاں اللہ، اس کا رسول ایمان دار لوگ اور شیاطین سب ایک ہیں یہی وجہ ہے کہ نابلسی کے ہاں کسی انسان کا اپنے وجود کو الگ قرار دینا اور وحدۃ الوجود کا قائل نہ ہونا گناہ ہے اور جو شخص اللہ کے وجود کے ساتھ اپنے وجود کو بھی سمجھتا ہے۔ وہ اللہ کا باغی ہے! ان کی یہ بات جہالت پر مبنی ہے۔

ہاں اگر بظاہر مختلف وجود نظر آ رہے ہیں تو صرف صفات کے امتیازات کے پیشِ نظر ہیں۔ اور صفات میں تغائر حقائق کے تغائر کا پیش خیمہ ہے۔ مثلاً صفات میں غفور، حلیم، منتقم صفات ملاحظہ فرمانے سے تمام پیچیدگیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

---

[۱] الفتح الربانی ص ۵۱)

چنانچہ جنید بغدادی کہتے ہیں کہ مجھے کسی چیز سے اتنا فائدہ نہیں پہنچا جتنا کہ مجھے اس شعر کے سننے سے ہوا جب میں ایک سڑک پر سے گذر رہا تھا تو شاعر کہہ رہا تھا۔

وان قلت ماذنبی الیک ؟ اجبتنی	میں جب پوچھتا ہوں کہ میرا کیا گناہ ہے تو مجھے
وجودك ذنب لا یقاس بہ ذنب۔	جواب ملتا ہے کہ تیرا اپنے وجود کو الگ سمجھنا ایسا
لہ	گناہ ہے۔ جس کے برابر کوئی گناہ نہیں۔

نابلسی ابھی پر بس نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے کہ انسان گناہ کی حالت میں جس قدر اللہ کے قریب ہوتا ہے۔ اس قدر اطاعت کی حالت میں نہیں ہوتا ہے۔[2]

نابلسی کے ہاں صدیق اور زندیق میں فرق

نابلسی کے ہاں وہ انسان زندیق ہے جو سمجھتا ہے کہ اس کا کفر، فسق صرف اس سے صادر ہو رہا ہے۔ اور صدیق وہ ہے جو سمجھتا ہے کہ تمام افعال کا صدور اللہ سے ہوتا ہے۔ اور مومن، کافر، فاسق، نیکوکار تمام اللہ کی ذات اور اس کے وجود کے مختلف مظاہر ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ ما ترٰی فی خلق الرحمٰن من تفٰوت[3] (تو اللہ کی مخلوق میں کچھ فرق نہیں پاتا) لہذا مومن کافر سب اللہ کی مخلوق ہے۔ ان میں کچھ فرق نہیں۔ لیکن جو شخص اس حقیقت سے غافل ہے اور سمجھتا ہے کہ کافر خود اپنے

لہ الفتح الربانی ص ۹ نم) [2] الفتح ص ۵۸) [3] نابلسی نے اس ٹکڑے کو آیت سے الگ کر کے کس قدر غلط مفہوم پیش کیا ہے۔ آیت کا مفہوم سیاق و سباق سے واضح ہوتا ہے اس سے پہلے بیان کیا ہے۔ کہ اللہ پاک نے سات آسمان برابر بنائے جن میں کچھ تفاوت نہیں ہے۔ آسمانوں کا بنانا اللہ کا فعل ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسانوں کے فعل میں بھی تفاوت نہیں ہوتا جب کہ یہ تفاوت واضح ہے۔ کیا ایمان، کفر میں تفاوت نہیں ہے۔

کفر کا صانع ہے۔ اور اپنے فعل کا خالق اور مستقل بالذات ہے تو اس کے زندیق ہونے میں کچھ شک نہیں۔

نیز نابلسی کہتا ہے کہ اس عالم میں دین پسند لوگوں کے لحاظ سے صرف دو دین موجود ہیں۔ ایک دین حق ہے جس کا نام اسلام ہے۔ اور اسلام کے علاوہ تمام دین باطل ہیں لیکن اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے لحاظ سے تمام ادیان خواہ وہ حقہ ہیں یا باطلہ تمام اس کی مخلوق ہیں۔ اور وہ ان کا خالق ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے۔ (ولہ اسلم من فی السمٰوٰت والارض طوعًا وکرھًا) (آسمانوں اور زمین کی تمام چیزیں خوشی سے یا ناخوشی سے اسی کے لیے فرمان بردار ہیں) یعنی مومن کافر سب اس کے مطیع ہیں۔ البتہ مومن طوعًا مطیع ہیں۔ اور کافر ناخوشی سے اس کی اطاعت میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اس لیے کہ کافروں کے لحاظ سے بھی ان کا کوئی خالق نہیں۔

پس جو شخص فریقین کے ظاہر کو دیکھتا ہے اور ان سب کو راہ ثواب پر سمجھتا ہے۔ وہ زندیق ہے اور جو ان کے ظاہر کو نہیں دیکھتا اس کی نظر صرف اللہ کی جانب اٹھتی ہے۔ جو سب سے اوپر ہے اور یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ جو کچھ بھی انسانوں سے صادر ہو رہا ہے۔ وہ سب چونکہ اللہ کی جانب سے ہے۔ اس لیے درست ہے اگرچہ فرق بہت گہرا تھا تاہم اللہ کی توفیق اور اس کی اعانت سے ہم نے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

کیا ذوات اور احوال کے لحاظ سے تمام انسانوں کو مساوی قرار دینا جہالت کا منہ بولتا ثبوت نہیں ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

افنجعل المسلمین کالمجرمین ما لکم کیف تحکمون ۵۱	کیا ہم مسلمانوں کو مجرموں کی مانند بنا دیں گے تمہیں کیا ہو گیا ہے تم کس طرح فیصلہ کرتے ہو۔

نیز فرمایا:

ام نجعل الذین امنوا وعملوا الصلحت کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار ۵۲	کیا ہم ایمانداروں اور نیک عمل کرنے والوں کو ان لوگوں کی مانند بنا دیں گے جو زمین میں فساد برپا کرتے والے ہیں یا ہم پرہیزگاروں کو فجار کی مانند بنا دیں گے۔

معلوم ہوتا ہے کہ دونوں جماعتوں میں تمیز قائم رکھنا ضروری ہے اور وہ شخص جھوٹا ہے۔ جو ان کو مساوی قرار دیتا ہے لیکن کبھی صدیق کے کلام میں خفا ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور غلطی سے اس کو زندیق کا کلام سمجھ لیا جاتا ہے غلطی کا پتہ دوسرے مقام سے لگتا ہے۔ چنانچہ شیخ محی الدین ابن عربی فتوحات مکیہ میں لکھتا ہے۔

(عقد البریۃ فی الالہ عقائد وانا اعتقدت جمیع ما اعتقدوہ مخلوق کے اللہ کے بارے میں مختلف عقائد ہیں اور میں ان تمام عقائد کو تسلیم کرتا ہوں) مقصود یہ ہے کہ تمام کا صدور اللہ سے ہو رہا ہے۔ اور وہ اللہ کے آثار ہیں جو اس پر دلالت کر رہے ہیں اگر ان کا صدور مخلوق سے ہوتا ہے۔ تو وہ مخلوق پر دلالت کرتے ہیں! لہذا آثار کی طرف کچھ زیادہ توجہ دینے کی ضرورت نہیں البتہ مؤثر کی طرف دیکھنا چاہیئے ۵۳

---

۵۱ القلم ۳۵، ۳۶) ۵۲ ص ۲۸) ۵۳ الفتح ۸۵-۸۶)

عقیدہ باطنیہ کی وضاحت

نابلسی کی عبارت سے عقیدہ باطنیہ کی اصل صورت واضح ہو کر سامنے آگئی ہے جس کو فروغ دینے میں صوفیاء نے ایڑی کا زور لگایا اور اس عقیدے کے پھیلانے میں انہوں نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی کہ تمام موجودات ذات اللہ کی حقیقت کے مظاہر ہیں اور بلحاظ مخلوق کے افعال میں تفاضل ہے۔ بلحاظ فاعل حقیقی کے ان میں تفاضل نہیں ہے۔ سب ایک ذات پر دلالت کرتے ہیں۔

اس عقیدے نے تمام ادیان کو غلط قرار دیتے ہوئے اور تمام شریعتوں کو ناقابل عمل بناتے ہوئے تمام محرمات کو حلال قرار دے دیا۔ خیال رہے کہ عقیدہ باطنیہ کی یہ وضاحت ان کے کسی کلام سے استنباط کرتے ہوئے یا ان کی عبارت کا غلط مطلب نکال کر پیش نہیں کی گئی بلکہ ان کی واضح عبارت اس پر صراحتاً دلالت کر رہی ہیں جیسا کہ آپ نے ابن عربی کے شعر کا ملاحظہ کیا جس کی تشریح ہم پہلے کر چکے ہیں اور ابن عربی کی زبان سے بتا چکے ہیں کہ جو شخص یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ ایک دین سچا ہے اور اس کے علاوہ تمام ادیان باطل ہیں وہ راہ ہدایت سے محروم ہو گیا جب کہ وہ حقیقت کے ایک جز پر ایمان رکھتا ہے۔ حالانکہ ضروری تھا کہ وہ کامل حقیقت پر ایمان رکھتا یعنی وہ یہ نظریہ رکھتا کہ تمام ادیان کا خالق اللہ ہے۔ اور تمام ادیان صحیح ہیں۔

اس میں نابلسی اپنے استاد سے دو قدم آگے نکل گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تصوف میں زہد کا مقام اس کا آخری زینہ نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اسے صوفیاء کے ہاں ایک مرحلہ کہا جا سکتا ہے۔ جب کہ تصوف کا آخری مرحلہ زہد کو خیر باد کہنا ہے اور مقدر پر صابر اور شاکر رہنا ہے۔ اور غیر اللہ کی طرف نظر

اٹھانا دراصل اپنی روحانیت کو ان عوارض کے حوالے کر دینا ہے۔ جو اس پر وارد ہوتے رہتے ہیں جن کے نتیجہ میں ذات اللہ سے حجاب ہو جاتا ہے اور یہ حجاب کفر ہے اور وہ لوگ جو کائنات کی چیزوں سے اعراض کرتے ہیں۔ وہ تصوف کے صحیح مقام سے بے خبر ہیں اس لیے کہ ان کا اللہ کے ماسویٰ کا ملاحظہ کرنا ہی انہیں اللہ سے غافل کر رہا ہے۔ اگرچہ وہ ملاحظہ کرنے کے بعد ان سے اعراض کر رہے ہیں۔ لہٰذا ان کے کفر کو خفی کفر سمجھا جائے گا۔ اگر وہ ہوش سے کام لیتے تو انہیں اللہ کا ماسویٰ نظر ہی نہ آتا اور جب اللہ کا ماسویٰ معدوم ہے تو ان کا اللہ کے ماسویٰ سے اعراض کرنے کا کیا معنیٰ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں اللہ کا ماسویٰ موجود ہے۔ یہی ان کو کافر بنا رہا ہے کیا ہوا اگر وہ اس سے اعراض کر رہے ہیں۔

پس چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اس کی طرف ہی توجہ رکھتے اور کسی چیز کا تصور بھی ان کے دماغ میں نہ آتا۔ ایک شاعر اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے۔

تجرد عن مقام الزهد قلبي فانت الحق وحدك في شهودي ازهد في سواك وليس شئ اراه سواك ياسر الوجود (الفتح الربانی ص ۱۳۴)	اے لطیف ذات! میرا دل زہد کے مقام سے خالی ہے اس لیے کہ میرے مشاہدہ میں صرف تو ثابت ہے کیا میں تیرے سوا سے اعراض کروں جب کہ تیرے سوا مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔

ان اشعار میں زہاد کو کفر کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ کے ماسویٰ کو معدوم نہیں سمجھتے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ مقدر میں لکھا گیا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اس سے اعراض کرنے کی ضرورت نہیں پس ان سے اعراض کرنے والے دراصل تقدیر کی مخالفت کرنے والے ہیں۔ گویا کہ ان کے زہد نے ان کو

اللہ سے مشغول کر دیا ہے اس لیے وہ کافر ہو گئے ہیں۔

نابلسی کا علمی مقام

میں چاہتا ہوں کہ قارئین کو آگاہ کیا جائے کہ نابلسی ناتجربہ کار اور جاہل انسان نہیں ہے۔ بلکہ صوفیاء کے ہاں اسے تقدم حاصل ہے اور اس کے اقوال بطور استشہاد کے پیش کیے جا رہے ہیں۔ لیکن بعض ان کے اقوال تسلیم کرنے سے معذرت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے اقوال شطحات کے قبیل سے ہیں اور صوفیاء کے شطحات پر انہیں گرفت نہیں ہو گی شطحات کا اطلاق صوفیاء کے ہاں ان باتوں پر ہوتا ہے جو غلبۂ محبت اور جذب مستی کے عالم میں ان کی زبان سے نکل جاتے ہیں لیکن اگر صوفیاء کے اس قول کو تسلیم کر لیا جائے کہ ان کے شطحات کا کچھ حساب نہیں ہو گا۔

تو اس سے مراد یہ ہے کہ غلبۂ حال میں ان کی زبان سے ایک کلمہ یا ایک جملہ نکل گیا۔ جو شریعت کے خلاف ہے تو وہ قابلِ عفو ہے لیکن اگر کوئی صوفی غلبہ وجد و مستی میں دو سو کتابیں تحریر کر ڈالے تو کیا ان تمام شطحات میں اس کو معذور سمجھا جائے گا؟ ہر گز نہیں اس لیے کہ دو سو کتاب تحریر کرنے میں بیسوں سال لگیں گے تو اتنے طویل عرصہ میں اس کے جمع کردہ شطحات کو کیسے حقائق کا نام دیا جا سکتا ہے۔ جب کہ اس پر حالتِ سکر کا غلبہ رہا اور وہ اصل حقائق سے بے خبر رہا۔

پھر اسی پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ صوفیاء نے کھلم کھلا دین اسلام کی عمارت کو مسمار کرنے کے منصوبے بنائے۔ جب انہوں نے تصوف کی آخری منزل پر پہنچ کر کفر، ایمان میں مساوات کا رشتہ قائم کیا اور مقام زیھر جو کہ تصوف کا ایک

مرحلہ ہے) کو شرک خفی کہا۔ اس لیے کہ زہد کی صورت میں اللہ کی ذات نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

تصوف کے اس نظریہ کے بارے میں یہ کہنا (کہ یہ محض نظریہ کی حد تک ہے صوفیاء کی زندگی میں اس کا عملی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا) بالکل غلط اور حقیقت سے آنکھیں بند کرنے کے مترادف ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ صوفیاء نے جب عقیدہ باطنیہ کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالا تو اس کے احوال و نتائج سے عقل انسانی کو اس قدر گھبراہٹ ہوئی کہ اس نے اس قسم کے ناگفتہ بہ واقعات کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر کیا کیا جائے جب کہ وہ واقعات جن کو خیالات میں لانا ہی جرم تھا وہ حقیقت ثابتہ بن کر نظروں کے سامنے رقصاں تھے۔

پس میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ بلا دلیل کوئی دعویٰ کیا جائے۔ لہٰذا میں کوشش کروں گا کہ قارئین کے دلوں میں افکار صوفیا کا ایک نقشہ مرتسم کر دوں اور کتاب و سنّت کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد ان کے بارے میں آخری فیصلہ دیا جائے۔

اور صوفیاء کے نظریات، عقائد وغیرہ ان کی قابلِ اعتماد کتابوں سے نقل کیے جائیں گے۔ جن کی تکذیب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ مجادلہ، مکابرہ کا انداز ان کی حقیقت کو بدل سکتا ہے۔ جب کہ وہ نظریات، اعتقادات کی حد سے آگے عملاً معاشرے میں موجود ہیں۔ پھر تقریباً ہر دور کے صوفیاء کے حالات اور ان کے اقوال کی روشنی میں ان کے نظریات کی وضاحت کی جائے گی تاکہ قارئین پر واضح ہو جائے کہ یہ حال ایک فرد کا نہیں ہے۔ بلکہ اس فتنے نے تو

اپنی لپیٹ میں لاکھوں صوفیاء کو جکڑ رکھا ہے اور دینی لحاظ سے انہیں جہنم کے گڑھے میں گرا دیا ہے۔

چند مثالیں

پہلی مثال شیخ نابلسی جو صوفیاء کے ہاں مشہور عالم سمجھے جاتے ہیں جن کے ادیب اور شاعر ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں پہلے بھی ان کے اقوال بیان کیے گئے ہیں۔ اب ہم اس کے کلام سے کچھ اقتباسات پیش کر رہے ہیں جن میں اس نے شراب کے ساتھ ساتھ بجائے صنفِ نازک کے امرد لڑکوں کے ساتھ تشبیب کی ہے شائد ابو نواس جیسا رنگین مزاج شاعر بھی اس قدر عریانی کے ساتھ امرد لڑکوں کا محبت بھرے انداز میں ذکر نہیں کر پایا ہے۔ جس طرح اس نے کیا ہے۔

الفتح الربانی سے اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

بدا کالبدر علی غصن فقلت لہ اللہ اکبر	محبوب چودہویں رات کی چاند کی مانند ظاہر ہوا۔ اس کا قد شاخ کی مانند تھا میں نے اسے دیکھتے ہی اللہ اکبر کہا اور کہا کہ اہل عرب میں تو کوئی حسین ہی نہیں تعجب ہے تعجب ہے اے میری آنکھ نظارہ تو کر
لیس الحسن فی العرب باللہ یا طرفی	
اجل نظراً کم تحت ملۃ ذا التوکی من عجب	اس ترکی لڑکے کے دامن میں کون ہے۔ میں اس رات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جب وہ محبوب بڑی احتیاط کے ساتھ رقیب سے بچتا بچاتا میرے
لم انس لیلۃ وافانی علی حذر	
من الرقیب و شخص اللیل لم یغب	

پاس آیا رات ابھی ختم نہ ہوئی تھی ۔

نیحی علی المنی یاقلب وانظر الی المقصود
باطراف الرجاء وخن ما اوھبتہ لك
اللیالی من اللذات قبل القضاء ولا تحفل
بزید او بعمرو والق الکل فی بحر الھباء
وکن مستغنیًا باللہ واقنع بما بولی
الیك من العطاء

اے دل تو آرزوؤں پر زندہ رہ اور اے آنکھ تو پُر اُمید
ہو کر مقصود کو دیکھ اور جن لذات کو زمانہ تجھے عطا کر چکا
ہے ان کے اختتام سے پہلے ان سے ہم کنار رہ تجھے
زید، عمر کے ساتھ مشغول نہیں ہونا چاہیے ۔ان سب
کو فنا کے سمندر میں گرا دے اور اللہ کے ساتھ استغناء
طلب کرنے والا ہو جا اور وہ جو کچھ تجھے عطا کر رہا ہے
اس پر قناعت اختیار کر ۔

الٰھی لیس للعشاق ذنب لانك انت
قبلی العاشقینا وتخلق کل ذی وجہ
جمیل نکادلہ نصلی العابدونا
ونامرونا بغض الطرف عنھو
کانك ما خلقت لنا عیونا ۔لو
شاء ربی ان یصون عبادہ ۔ما
کان یخلق فی الانام ملاحًا
وما ترکت الھوٰی کلا وکیف وھل
تخفی او الملاحۃ فی اولاد اتراك
وجہ ملیح وشعر اسود جعد واجبرنی
بین اضواء واحلاك ۔

اے میرے خدا ۔ عاشقوں کا کیا گناہ ہے جبکہ تو
خود ہی عشاق کو عشق میں مبتلا کرتا ہے ۔ اور تو ہی خوبصورت
چہروں کا خالق ہے جن کی خوبصورتی کے لیے
عبادت گزار ان کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے
ہیں ۔ تعجب ہے کہ تو ہمیں خوبصورتوں سے نظریں
نیچی کرنے کا حکم ہے ۔ شاید تو نے ہمیں دیکھنے کے
لیے آنکھیں عطا نہیں کی ہیں ۔ اگر میرا خدا چاہتا کہ
اپنے بندوں کو عشق بازی سے محفوظ کرے ۔ تو دنیا میں
کسی حسین کو پیدا نہ کرتا ۔ میں عشق بازی نہیں چھوڑوں گا
ہرگز نہیں ۔ اور کیا ترک لڑکی چھوٹی مزاج کی خوبصورتی پوشیدہ
رہ سکتی ہے ۔ جن کا چہرہ خوبصورت ۔ بال سیاہ گھنگریالے

قام يسعى بها فطاف قلبي طائف
الشوق بسعه نثر حيا من بني الترك
أحور الطرف أحوى في هواه تركت
سلمى وميا سلفه
ولقد لبست عليه ثوب حبابه
بما تختر في ملاحته يوسف

مجھے حیرت تھام لیتی ہے۔ جب میں روشنی اور ظلمت کو یکجا دیکھتا ہوں۔

وہ اس کے اردگرد دوڑتا رہا۔ تو میرے دل میں بھی عاشقانہ خیالات گھومنے لگے۔ تو میں نے ترکی محبوب کو محبت کا سلام کہا۔ جس کی آنکھیں سرمئی تھیں اور میں نے اس کی محبت کے مقابلے میں سلمیٰ اور میا کے عشق کو خیرباد کہہ دیا۔ میں نے اپنے محبوب کو عشق کے لباس میں دیکھا۔ تو یوں معلوم ہوا۔ کہ وہ حسنِ یوسف کے فخر میں اکڑ اکڑ کر چل رہا ہے۔

ان اشعار کے ذکر کرنے سے مقصود یہ ہے۔ کہ صوفی شاعر بجائے لڑکیوں کے ساتھ معاشقہ کرنے کے لڑکوں کے ساتھ معاشقہ کا ذکر کرتا ہے۔ اس لیے جا بجا مذکر کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ پھر کس قدر افسوس ناک حرکت ہے کہ اپنے ترکی نژاد محبوب کو حسن و جمال اور چال ڈھال میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے۔ اور کتنی بڑی جسارت اور ناشائستگی ہے۔ کہ اللہ کے پیغمبر کے ساتھ اس قسم کے بدقماش لوگوں کو تشبیہ دی جائے۔ ہائے اللہ۔ ہم تو تیری رحمت مانگتے ہیں لیکن ان لوگوں پر تیرا عذاب کیوں نازل نہیں ہوتا۔

ایک سوال

اگر ان کی جانب سے جواب دیتے ہوئے کوئی شخص کہتا ہے۔ کہ یہ تو شاعرانہ تخیل ہے۔ اور شاعر ادیب لوگ اپنے کلام میں ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ جن کو وہ خود بھی حقیقت نہیں سمجھتے۔ ان پر تنقید کرنا اور ان پر تہمت

باندھنا درست نہیں ہے۔

جواب (۱) ہم تسلیم کرتے ہیں۔ کہ شعر اور نثر میں نمایاں فرق ہے۔ شعر میں شاعر اپنے شعور کو الفاظ کا لباس پہناتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا شعور اس کے دل کی گہرائی سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کبھی شاعر ترنگ میں آکر ایسی بات کہہ دیتا ہے۔ جس کو وہ عملی زندگی میں نہیں لاتا لیکن بہرحال اس کے اشعار اس کے احساسات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اور اس کے اشتیاق کا اندازہ لگانا آسان ہوتا ہے۔ کیا اگر کوئی شخص تحت الشعور ناپاک خیالات کو پیدا کرتا ہے۔ اور امرد لڑکوں کے حسن و جمال کے ساتھ تشبیب سے نہیں جھینپتا۔ بلکہ فرحت محسوس کرتا ہے۔ اور وارفتگی کی حالت میں قصیدے کہتا ہے۔ تو وہ اس کے مواخذہ سے کیسے بچ سکتا ہے۔

جواب (۲) ہمیں کیا ضرورت ہے۔ کہ ہم اس کے وکیل بن کر اس کی صفائی پیش کریں جب کہ وہ اس قسم کے عاشقانہ خیالات کو اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ سمجھتا ہے۔ اور اس کا نظریہ اور اعتقاد یہی ہے۔ تو ہم کیوں یہ بات کہیں کہ یہ تو اس کا شاعرانہ تخیل تھا۔ نیز شیخ نابلسی برملا کہتے ہیں۔ کہ زاہد انسان تو پروردگار عالم سے دور ہے۔ وہ تو اللہ کے ساتھ شرکِ خفی کرتا ہے۔ لیکن میں اللہ کے ساتھ شرک خفی نہیں کرنا چاہتا۔ تو ہم اس سے ان باتوں کی نفی کیسے کر سکتے ہیں۔ جس کو وہ خود پسند کرتا ہے۔

دوسری مثال شبلی صوفی سے مروی ہے۔ جس کا شمار تیسری صدی کے صوفیاء میں ہوتا ہے۔ جو جنید بغدادی کے شاگردوں میں سے تھے۔ اُن کا جسم فربہ تھا اور وہ لوہے کی سلائیاں گرم کر کے آنکھوں میں

ڈالتا۔ تاکہ نیند نہ آئے۔ ان سے مروی ہے۔ کہ اس نے ابلیس کو دیکھا تو شبلی نے ابلیس کو آواز دی۔ ابلیس نے شبلی سے کہا۔ مجھے تم سے کچھ کام نہیں۔ میں تمہاری گمراہی سے فارغ ہو چکا ہوں۔ ہاں میں تمہیں ایک لطیفہ سناتا ہوں۔ شبلی نے کہا وہ کیا ہے۔

ابلیس نے کہا۔ تم تو نوخیز لڑکوں کے ساتھ محبت کرتے ہو۔ شبلی نے کہا۔ درست ہے۔ اس سے شائد ہی کوئی صوفی محفوظ رہا ہو۔

تیسری صدی کے اس انسان کی شہادت سے پتہ چلتا ہے۔ کہ عام طور پر صوفیار بے ریش لڑکوں کے ساتھ رفاقت اختیار رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ صوفیار ایک حدیث پیش کرتے ہیں (النظر الی وجہ الامرد عبادۃ) بے ریش لڑکے کے چہرے کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شبلی سے منقول ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں۔ کہ مجھے اس وقت تک سکون حاصل نہ ہوتا۔ جب تک میں کسی بے ریش لڑکے کو نہیں دیکھ لیتا [1]

شبلی کے اس قول پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے اور جو لوگ ان کے اس قول کی تاویل کرتے ہوئے کسی جدید معنیٰ کا لباس پہنانے کی کوشش کریں گے وہ ہرگز ہرگز کامیاب نہیں ہوں گے۔

خیال رہے کہ شبلی کا شمار اونچے طبقہ کے مشاہیر صوفیار سے ہوتا ہے۔ جنید بغدادی اور ان کے ہم عصر مشائخ سے انہیں تلمذ حاصل تھا اور اپنے دور کا منفرد عالم تھا۔ امام مالک کے مذہب کو ترجیح دیتا تھا [2]

---

[1] طبقات الشعرانی ص ۱۰۲ [2] طبقات ص ۱۰۲

تیسری مثال شعرانی طبقات الکبریٰ (۲ر۱۳۵) میں سیّد علی وحیش کے متعلق ذکر کرتے ہیں کہ وہ جب اس شہر یا دوسرے شہر کے کسی شیخ کو گدھی پر سوار دیکھتے تو اس کو گدھی سے اترنے کا حکم دیتے۔ نیز اسے کہتے کہ آپ گدھی کا سر تھام رکھیں تاکہ میں اس کے ساتھ بدفعلی کروں۔ اگر شیخ نہ اترتے یا سر تھامنے سے انکار کرتے تو وہ زمین کے ساتھ چمٹ جاتے ایک قدم چلنے کی بھی طاقت نہ رہتی اور اگر چشم پوشی کرتا تو سخت شرمندگی کے ساتھ کھڑا رہتا جب کہ لوگ راستہ سے گذر رہے ہوتے تھے۔

اس واقعہ پر قطعاً کچھ تبصرہ کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ کس قدر حیرت ہے کہ اس قسم کے واقعات کو ان کی کرامات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور انہیں سیّد علی وحیش رضی اللہ عنہ کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔

غور کیجئے کہ یہ لوگ کس دین کی جانب دعوت دے رہے ہیں۔ کیا عدل و انصاف کا یہی تقاضا ہے۔ اللہ کا ڈر اختیار کیا جائے۔ قیامت کے روز ہم سب نے اس کے سامنے کھڑے ہونا ہے۔

چوتھی مثال ابو نصر سراج طوسی مولف کتاب اللمع جو تصوف میں انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے) میں ان صوفیاء کو برا بھلا کہتے ہیں جنہیں اصلی صوفی نہیں کہنا چاہیے۔ وہ تو محض سماع، موسیقی اور رقص میں اصلی صوفیوں کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقی صوفی تو وہ ہے جس کے لیے وہ تمام کام مباح ہیں جو دوسروں کے لیے مباح نہیں ہیں۔

وہ مذکورہ کتاب کے صـ ۵۳۰ پر رقمطراز ہے کچھ لوگ اس وہم میں مبتلا ہیں کہ

تصوف سے مقصود یہ ہے کہ قوالی کی مجلسوں میں شریک ہوا جائے اور تکلف کے ساتھ وجد کی کیفیت طاری کی جائے۔ نیز کھانے وغیرہ پر تکلف کے ساتھ رفقاء کو جمع کیا جائے۔ اور درد انگیز عشق آفریں قصائد ترنم آمیز لہجہ میں پڑھے جائیں خصوصًا وہ اشعار جو صوفیاء کی عشق بازی ہوس رانی کی عکاسی کرتے ہوں حالانکہ تصوف سے مقصود یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وجد آفریں قوالی کی مجالس کا انعقاد کیا جائے اور کھلے بندوں عشق بازی کا بازار گرم رکھا جائے۔ اور موسیقی کے نغمات پر حال کھیلا جائے اور ہائے ہو کا غلغلہ بلند کیا جائے

مزید وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔ کہ اگر کوئی صوفی یہ کام کرتا ہے۔ تو اس پر کچھ قدغن عائد نہیں کی جاسکتی۔ لیکن اگر غیر صوفی یہی کام شروع کر دے۔ تو اسے روکنا چاہیے۔ اس لیے کہ غیر صوفی کے دل میں دنیا کے ساتھ محبت ہوتی ہے۔ جب کہ صوفی کا دل پاک ہوتا ہے۔ اور دنیا کے ساتھ محبت کا ادنیٰ سا شائبہ بھی وہاں موجود نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی وہ دنیوی حرص و آز کے جال میں پھنسا ہوتا ہے۔ اس کا دل ذکر الٰہی سے کبھی غافل نہیں رہتا۔ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز وہ قول ہے۔ جو صوفیاء کے لیڈر جنید بغدادی سے منقول ہے۔ وہ کہتا ہے۔ صوفی پر تین حالتوں میں رحمت خداوندی کا نزول ہوتا ہے۔ جب وہ گانا سنتا ہے۔ اور راس پرستی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ بلکہ گانا سننے سے پہلے ہی وہ جذب و مستی کی کشش اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح جب وہ منہ میں لقمہ ڈالتا ہے۔ یا زبان سے کچھ کہتا ہے۔ تب بھی اس پر اللہ کی رحمت سایہ افگن ہوئی ہے۔ اس لئے کہ وہ نہ تو بلا ضرورت کچھ کھاتا ہے اور نہ ہی بلا ضرورت کوئی بات کرتا ہے[1]

نیز اس سے سراج طوسی نے نقل کیا۔ کہ اس سے دریافت کیا گیا کہ جب آپ گانا سنتے ہیں۔ اور آپ کے دوسرے صوفی رفقاء بھی اس مجلس میں سماع سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے ہیں تو آپ پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے لیکن اب ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کی حالت مستی والی نہیں ہوتی جنید بغدادی نے جواباً ذیل کی آیت سے استدلال کرتے ہوئے اپنے اوپر ہونے والے ایک راز کو ختم کر دیا۔ وہ آیت یہ ہے۔ وتری الجبال تحسبہا جامدۃ وھی تمر مر السحاب صنع اللہ الذی اتقن کل شئ (اللمع ۳۶۶، ۳۶۷) اور تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو۔ تو خیال کرتے ہو کہ یہ اپنی جگہ پر کھڑے ہیں۔ مگر وہ اس روز اس طرح اڑتے پھریں گے۔ جیسے بادل یہ خدائی کاریگری ہے۔ جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا۔ غور کیجئے۔ جنید بغدادی پر محفل سماع میں کس قدر وجد طاری ہوتا ہے۔ اور جب سماع کی مجلس ختم ہو جاتی ہے۔ تو وجد کی کیفیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ خیال رہے کہ تیسری صدی ہجری میں جب صوفیاء کو وجد کی کیفیت طاری ہونے پر مطعون قرار دیا گیا تو انہوں نے معذرت پیش کرتے ہوئے کہا۔

صوفیاء کی معذرت

سراج طوسی اپنے شیخ سے روایت کرتے ہیں۔ کہ صوفیاء کا سماع کی مجالس میں حاضر ہونا چند مقاصد کے پیش نظر ہوتا ہے۔ کبھی وہ اپنے رفقاء کی علمی ثقاہت عزم و استقلال اور ان کی فطری گہرائی سے متاثر ہوتے ہوئے شریک ہوتے ہیں تاکہ ان کی موجودگی میں محفل سماع کے آداب حدود اور شرائط سے مطلع ہو سکیں۔ اور کبھی دیگر اجنبی لوگوں کو اس راہ سے متعارف کرانے کے لئے وسعت ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے بظاہر شریک ہوتے ہیں۔ اگرچہ فی الحقیقت اُن سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ غالباً یہ بات حلاج کی طرف مذہب کی

جاتی ہے۔ اور اس کا ذکر صراحتاً اس لیے کیا گیا ہے۔ کیونکہ کتاب جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ حلاج کے قتل کے بعد تالیف ہوئی ہے۔ اللمع ص (۳۶۷)

اگر غور کیا جائے تو یہ معذرت اور اس قسم کے دیگر عذران گناہوں سے کہیں زیادہ قباحت لیے ہوئے ہیں۔ اس سے بڑی منافقت اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہ وہ اس قسم کی مجلسوں میں صرف وجود کے لحاظ سے شریک ہوتے ہیں۔ اور ان کے دل اس کے ساتھ موافقت نہیں کرتے اگر ہم تفصیل کے ساتھ صوفیاء کے افکار خبیثہ شمار کرنے بیٹھ جائیں۔ تو ہمیں خطرہ ہے۔ کہ ہم بھی کہیں حد اعتدال سے تجاوز نہ کر جائیں۔ جب کہ ہمارا مقصد صرف اتنا ہے۔ کہ ہم مسلمانوں کو ان کے باطنی غلط نظریات سے آگاہ کریں۔ اور تمثیلی رنگ میں ان کے گمراہ کن عقائد سے پردہ کشائی کریں۔

حقیقت یہ ہے۔ ہر دور میں ان لوگوں کی مذہبی حالت حیران کن رہی ہے۔ اور ان کے بارے میں کھل کر کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ امت مسلمہ ان کے حالات سے پریشانی کے عمیق گڑھے میں گری ہے اسے نجات اور سلامتی کا راستہ نہیں مل سکا۔ ہم نے سابقہ اوراق میں جو واقعات پیش کیے ہیں۔ یہ ان صوفیاء کے نہیں ہیں جو عوام میں مشہور نہیں۔ اور نہ ایسے لوگوں کے کوائف ذکر کیے ہیں جن کی حیثیت قوم کے ہاں مسلم نہ تھی بلکہ ایسے سربرآوردہ صوفیاء کی زندگی کے ایسے نقوش ذکر کیے ہیں۔ جو زمانے کی دست برد سے محو نہیں ہو سکے۔ اور جن کا مقام صوفیاء کے ہاں اس قدر بلند ہے کہ وہاں تک لوگوں کی رسائی ناممکن ہے۔

پانچواں باب

عقیدۂ تصوّف اور اس کے ادوار

اس سے قبل ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ تصوف اپنے دورِ آغاز سے ہی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ دنیا سے تعلقات کا کلیتہً انقطاع ہو۔ اور صرف اللہ کی ذات کے ساتھ وابستگی ہو۔ جس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ ازدواجی زندگی اختیار نہ کی جائے۔ اور نہ ہی رزق کی تلاش میں تگ و دو کی جائے۔ اس لیے جو شخص ان دونوں رزائل سے ہمکنار ہو گیا وہ اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہا۔ جیسا کہ ابراہیم بن ادہم زندگی بھر ان کا دامن ان کثافتوں سے آلودہ نہیں ہوا۔ صوفیاء کے ہاں اللہ سے تعلق استوار کرنا ضروری ہے۔ لیکن ان کے ہاں اللہ سے مراد وہ اللہ پاک نہیں۔ جس کی معرفت کا علم براہِ راست کتاب و سنّت سے حاصل ہوتا ہے۔ ان کے ہاں علم سلوک کی کچھ منازل ہیں۔ جن کو طے کرنے کے لیے سخت مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ اور جو شخص اس میدان میں اپنی تمام مساعی بروئے کار لاتا ہے۔ یقیناً وہ منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔ اور اللہ کی ذات کا اسے مشاہدہ ہو جاتا ہے۔ حقیقت کے چہرے سے نقاب اتر جاتا ہے۔ صوفیاء کا یہ عقیدہ صرف اللہ پاک کے لیئے ہی نہیں ہے۔ بلکہ تصوّف کے ابتدائی منازل سے لے کر آخری مدارج تک رسائی حاصل کرنے والا انسان جنّت دوزخ اور عالم غیب کا ان آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے۔ تمام غیبی پردے

چھٹ جاتے ہیں۔ اور کائنات کی کوئی چیز بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی۔

صوفیا کے ہاں عبادت خداوندی کا تصور

صوفیاء کا خیال ہے کہ اللہ پاک کی صحیح عبادت یہ ہے کہ جس میں آپ اللہ سے کسی قسم کا معاوضہ طلب نہ کریں۔ نیز آپ کو اپنا فعل نظر نہ آئے بلکہ آپ یہ سمجھیں کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کا فعل ہے۔ اس لیے کہ جو صوفی عبادت میں اپنی حیثیت کو سمجھتا ہے تو گویا اس نے اللہ کی ذات کا انکار کر دیا۔ صوفیاء اس نظریے کو ثابت کرنے کے لیے چند دلائل پیش کرتے ہیں ابوبکر کلاباذی اپنی کتاب التعرف لمذہب اہل التصوف (جسے تصوف کی انسائیکلوپیڈیا کہنا چاہیے جس کی اشاعت کا اہتمام ڈاکٹر عبدالحلیم محمود اور ڈاکٹر طٰہٰ عبدالباقی سرور نے کیا) میں ذکر کیا ہے کہ صوفی کے لیے ضروری ہے کہ وہ صحیح معنی میں اللہ کی عبادت کرے۔

یعنی کسی قسم کے معاوضہ کا خیال تک بھی اس کے ذہن میں نہ آئے، ارشاد خداوندی ہے۔ ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسہم واموالہم آیت کو ادھورا چھوڑتے ہوئے تو ثابت کیا ہے کہ عبادت کسی طمع اور لالچ کے بغیر ہونی چاہیے۔

حصول جنت کے لیے عبادت کرنا صوفیاء کے ہاں نافرمانی ہے۔ اور اگر کوئی صوفی عبادت میں اللہ سے جنت طلب کرتا ہے۔ تو اس کا جنت کو طلب کرنا بہت بڑا دینی نقص ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں مذکورہ دونوں ڈاکٹروں نے لکھا ہے کہ یہ کتاب علم تصوف نیز صوفیاء کے حالات اور ان کے مجاہدات وغیرہ پر مشتمل ہے ص ۱۴۱۔

اسی کتاب کے صفحہ ۱۵۵ پر درج ہے۔ کہ کچھ لوگ رابعہ بصریہ کی خدمت

میں اس کی بیمار پرسی کے لیے حاضر ہوئے۔ انہوں نے استفسار کیا آپ کا کیا حال ہے
اس نے جواب دیا خدا کی قسم مجھے اپنی بیماری کا کوئی سبب نظر نہیں آتا۔ ہاں ایک بات
محسوس ہو رہی ہے کہ مجھ پر جنت پیش کی گئی تو میرا دل اس کی جانب جھک گیا۔
میں نے خیال کیا کہ میرے آقا نے مجھ پر غیرت کی ہے ـــ وہ مجھ پر ناراض ہو گیا ہے۔
پس اسے راضی کرنا ضروری ہے۔

معلوم ہوا کہ صوفیاء کے ہاں جنت کی طرف صرف قلب کا میلان ہو جانا بھی قابلِ مواخذہ جرم
ہے۔ اس عقیدہ کو بعض آیات اور احادیث سے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔
چنانچہ پہلی دلیل میں ان اللہ اشتری آیت کا ذکر کرتے ہیں۔ حالانکہ اس آیت میں واضح طور پر
لهم الجنة کا ٹکڑا موجود ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ پاک نے مومنوں کے
جان و مال کو جنت کے بدلے خرید لیا ہے۔ اور ایمانداروں کے اعمال جنت کے حصول
کا سبب ہیں اگرچہ انہیں جنت کے برابر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن کسی مومن کو روکا بھی
نہیں جا سکتا کہ وہ رحمتِ خداوندی کا طلب گار نہ ہو اور جنت میں داخل ہونے کی دعا نہ
کرے۔ اور اس کے لیے کوئی کوشش نہ کرے بلکہ اسی کوشش کا نام ہی صحیح عبادت ہے۔

دوسری دلیل کلاباذی (کلوا واشربوا هنیئاً بما اسلفتم فی الایام الخالیة) کی
تفسیر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ الخالیہ کا معنی یہ ہے کہ جو ایام
اللہ کے ذکر سے خالی رہے۔ وہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جنت کا
حاصل ہونا اور اس میں نعمتوں کا ملنا اعمال پر موقوف نہیں بلکہ رحمتِ خداوندی پر موقوف
ہے۔ جیسا کہ اس آیت کا واضح مفہوم یہ ہے کہ چونکہ تم نے کچھ دن اللہ کا ذکر نہیں کیا تو
میری طرف سے اس کا استحقاق یہ ہے کہ میں نے تمہیں جنت میں داخل فرمایا پس تمہارا

جنت میں داخل ہونا میری عنایات کا کرشمہ ہے تمہارے اعمال کا اس میں کچھ دخل نہیں۔ کلاباذی کی یہ تفسیر نہ صرف یہ کہ راہ صواب سے دور ہے بلکہ آیت سے جو مفہوم مترشح ہوتا ہے۔ اس کے مخالف مفہوم کا پتہ دیتی ہے۔ اس کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ اللہ پاک قیامت کے دن ایمان والوں سے مخاطب ہو کر کہے گا کہ اب تم میری نعمتوں سے فائدہ حاصل کرو۔ بافراغت کھاؤ پیو اس لیے کہ تم نے زمانہ ماضی میں نیک اعمال کیے۔

تیسری دلیل

کلاباذی اپنے اس غلط عقیدے کو ثابت کرنے کے لیے ایک حدیث پیش کرتا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ روزہ میرے لیے ہے اور میں اس کا بدلہ دوں گا۔[1] اس حدیث کو بھی غلط انداز سے پیش کرتا ہے۔ چنانچہ حلاج جو بہت بڑا صوفی گزرا ہے وہ کہتا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ روزہ میرے لیے ہے اور میں اس کا بدلہ ہوں (ص ۱۴۳) حلاج کا یہ معنی بیان کرنا تحریف فی الدین ہے۔ وہ ذہن کے مطابق باطل عقائد ثابت کرنے کے لیے احادیث کے معنی میں تحریف کا مرتکب ہوتا رہا ہے۔

موجودہ دور میں بعض مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ عقیدہ بہت بلند عقیدہ ہے بھلا اس سے زیادہ اور بلندی پر رسائی کیسے ہو سکتی ہے کہ انسان اللہ کی عبادت کرے لیکن نہ اسے جنت کا لالچ ہو اور نہ دوزخ کا کھٹکا۔ لیکن یہ عقیدہ چونکہ کتاب و سنت کے خلاف ہے۔ اس لیے اس کو صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ غور کیجیے اللہ پاک نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بہترین اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: یدعوننا رغبا ورھبا وکانوا لنا خاشعین۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے بندے

۱؎ یہ حدیث بخاری اور مسلم میں موجود ہے نیز ترمذی میں بھی ابوہریرہ سے موجود ہے۔

جنت کے لالچ میں اور عذاب سے ڈرتے ہوئے اس کی عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ یہی حال انبیاء کا ہے۔ ان کا مقام تو تمام انسانوں سے اونچا ہے۔ اس لیے کہ وہ عقیدہ ایمان اور اعمال کے لحاظ سے تمام انسانوں سے زیادہ کامل واکمل ہوتے ہیں ایک دوسرے مقام میں کامل واکمل ایمان والے لوگوں کا وصف بیان کرتے ہوئے اللہ پاک فرماتے ہیں۔

انما یؤمن بآیتنا الذین اذا ذکروا بھا خروا سجدا وسبحوا بحمد ربھم وھم لا یستکبرون تتجافی جنوبھم عن المضاجع یدعون ربھم خوفا وطمعا ومما رزقنٰھم ینفقون فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین جزاءً بما کانوا یعملون

ہماری آیتوں پر تو وہی لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب ان کو ان سے نصیحت کی جاتی ہے تو سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں۔ اور غرور نہیں کرتے۔ ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں اور وہ اپنے پروردگار کو خوف اور امید سے پکارتے۔ اور جو مال ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

پس یہ وہ لوگ ہیں جو تمام لوگوں سے زیادہ پختہ ایمان والے ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے پروردگار سے خائف بھی ہیں اور پر امید بھی۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے ایسی نعمتیں تیار فرمائی ہیں جن کو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں نہ کوئی کان ان سے مانوس ہے اور نہ کسی انسان کے دل پر ان کا خیال گزرا ہے اس مفہوم کی آیات قرآن پاک میں بے شمار ہیں سنت میں بھی اس مفہوم کی بے شمار حدیثیں موجود ہیں۔ ان تمام سے زیادہ واضح دلیل ایک اعرابی کا قول ہے۔ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا اور کہا میں نہ تو آپ کی طرح خوبصورت الفاظ میں سرگوشی کر سکتا ہوں اور نہ ہی میں معاذ کا انداز اختیار

کرنا چاہتا ہوں۔ بس مجھے تو یہ کہنا ہے اے اللہ میں تجھ سے جنت کا سوال کرتا ہوں اور تیرے ساتھ جہنم سے پناہ مانگتا ہوں۔ اعرابی کے الفاظ سن کر فرمایا ہم سب جنت کے حصول کے لیے اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ اور اس سے مدد چاہتے ہیں۔ پس جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دعا کرتے ہوئے جنت کا سوال کرتے ہیں۔ تو کیا عقلاً ممکن ہے کہ کچھ لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ امتیازی شان رکھتے ہیں۔ اور آپ سے زیادہ کامل واکمل ہیں کہ وہ اللہ کی عبادت کرتے ہوئے یا اس سے دعا مانگتے ہوئے نہ جنت کا لالچ کرتے ہیں۔ اور نہ جہنم سے ڈرتے ہیں۔ صوفیاء اس حالت کو باقی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ کسی لالچ اور خوف کی وجہ سے اللہ کی عبادت میں مصروف نہیں ہوتے۔ عبادت سے ان کی غرض وغایت فنا فی اللہ ہونا ہے۔ نتیجتہً ان میں جذب اور مستی کی ایسی کیفیت ظاہر ہوتی ہے کہ وہ اپنے بارے میں یقین رکھتے ہیں کہ اللہ نے انہیں الوہیت کا لباس پہنا دیا ہے۔ اس طرح ذاتِ خداوندی ان میں حلول کر آتی ہے کہ اب دوئی کا امکان نہیں ہے۔

اس سے پہلے آپ معلوم کر چکے ہیں کہ مشہور صوفیاء رابعہ عدویہ جب بیمار ہوئی اور اس کے بعض رفقاء اس کی عیادت کے لیے گئے تو اس نے کہا کہ میری بیماری کا سبب اللہ کی غیرت ہے۔ میرے دل کا میلان جنت کے حصول کی طرف ہونے نے عتابِ خداوندی کو مجھ پر نازل کیا اور میں بیمار ہو گئی۔

ہم سوال کرتے ہیں کہ رابعہ عدویہ کو کیسے پتہ چلا کہ اللہ نے غیرت میں آکر اسے بیمار کر دیا ہے۔ اور یہ کیسے پتہ چلا کہ اللہ پاک اس کے اعمال کو شرفِ قبولیت بخش رہے ہیں۔ حالانکہ ایمان داروں کا وصف بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ارشادِ خداوندی ہے: ان الذین ھو من خشیۃ ربھم مشفقون والذین ھو بآیات ربھم یؤمنون والذین ھم بربھم لا یشرکون والذین یؤتون ما اتوا وقلوبھم وجلۃ انھم الی ربھم راجعون

مذکورہ آیات میں حضرت عائشہ نے یؤتون ما اتوا وقلوبھم وجلۃ کی تشریح کے بارے میں آپ سے استفسار کرتے ہوئے عرض کیا یا رسول اللہ کیا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو چوری کے مرتکب ہوتے ہیں اور زنا کاری کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اللہ سے خائف بھی ہیں آپ نے فرمایا صدیق کی بیٹی اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں روزہ رکھتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ انہیں یہ خوف دامن گیر رہتا ہے۔ کہ ان کے یہ اعمال شاید اللہ کے ہاں شرفِ قبولیت حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔[1]

پس جب مومن انسان ہمیشہ اللہ سے خائف رہتا ہے حالانکہ وہ طاعات بجا لا رہا ہے تو رابعہ عدویہ صوفیہ کون ہوتی ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرے کہ اسے اس بات کا علم ہوا ہے کہ اللہ نے اس پر غیرت کی ہے (العیاذ باللہ) اور پھر اس لیے غیرت کی ہے کہ اس کا دل جنت کی طرف مائل ہوا ہے۔ ہم صاف صاف کہے دیتے ہیں کہ اگر اس قول کی نسبت رابعہ کی جانب صحیح ہے۔ تو یہ قول رابعہ کا اپنا بنایا ہوا ہے بلکہ صوفیاء کی مسلم کتابوں میں مذکور ہے اور صوفیاء خود بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں۔

---

[1] مسند احمد ۱۵۹/۶، ۲۰۵ (سنن ترمذی ۲۰۱/۲) ابن ماجہ (۴۱۹۸) اس کی سند ضعیف منقطع ہے عبدالرحمن بن سعید بن وہب کی عائشہ سے ملاقات نہیں۔ حافظ ابن عسقلانی نے التہذیب میں اس کا ذکر کیا ہے لیکن ابن جریر (۲۶/۱۸) میں اس روایت کا ایک شاہد متصل مذکور ہے۔ جو اس روایت کو تقویت دے رہا ہے اس شاہد کی وجہ سے علامہ البانی نے الاحادیث الصحیحۃ (۱۶۲) میں اس کو حسن قرار دیا ہے۔

کہ اس قول کی نسبت اللہ کی طرف کرنا جہالت پر مبنی ہے اور شیطان کے بنائے ہوئے راستوں پر چلنا ہے جن سے اللہ پاک نے ہمیں منع فرمایا ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے۔

یاایھا الناس کلوا مما فی الارض حللا طیبا و لا تتبعوا خطوٰت الشیطٰن انہ لکم عدو مبین انما یامرکم بالسوٓء والفحشاء وان تقولوا علی اللہ ما لا تعلمون۔

لوگو۔ جو چیزیں زمین میں حلال طیب ہیں وہ کھاؤ، اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو۔ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تو تم کو برائی اور بے حیائی ہی کے کام کرنے کو کہتا ہے۔ اور یہ بھی کہ خدا کی نسبت ایسی باتیں کہو جن کا تمہیں کچھ علم نہیں۔

صوفیاء کے ہاں اللہ پاک اپنے بندوں میں حلول کرتا ہے

ابو یزید بسطامی جن کا شمار آئمہ صوفیاء سے ہوتا ہے تیسری صدی کے مشہور صوفیاء کے لیڈروں میں سرفہرست سمجھے جاتے ہیں۔ ان سے ایک آدمی نے فتویٰ پوچھا کہ وہ اپنے نفس میں صوفیا کے علوم سے کچھ خواہش نہیں پاتا تو ابو یزید بسطامی نے اسے عجیب و غریب فتویٰ دیتے ہوئے اپنے بارے میں ذیل کی باتیں کہیں۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ مجھے میرے خدا نے آسمان کی جانب بلند کیا پھر اپنے سامنے کھڑا کر لیا اور مجھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اے ابا یزید میری مخلوق تجھے دیکھنا چاہتی ہے۔ اس پر میں بول اٹھا میں نے کہا اے اللہ تو مجھے اپنی وحدانیت کا عطیہ دے کر زینت بخش اور اپنی انانیت کا مجھے لباس پہنا اور مجھے اپنی احدیت کی طرف بلند فرما۔ تو جب تیری مخلوق مجھ پر نظر ڈالے گی تو وہ بول اٹھے گی۔ اسے

اللہ ہم نے تیرا مشاہدہ کر لیا۔ پس وہاں اس وقت تو ہو گا اور میں نہیں ہوں گا یعنی تو نے مجھ میں حلول کیا ہو گا[1]

ابویزید بسطامی کا یہ قول کسی تبصرے کا محتاج نہیں۔ اگر کوئی شخص ان کی جانب سے معذرت کرتا ہے تو وہ بھی ابویزید کے ساتھ باطل باتوں کی اشاعت میں شریک کار ہے۔

جنید بغدادی اپنے وقت کے صوفیاء کے سرخیل ہیں۔ وہ ابویزید کے کلام کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ یہ اس شخص کا کلام ہے جس کو اللہ پاک نے وحدانیت کے حقائق کا لباس پہنایا۔ پس جو لباس اس کو پہنایا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ اس سوال کے کرنے سے مستغنی ہے اور اس کا یہ سوال اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اس جگہ کے قریب ہے۔ اور جو شخص کسی جگہ کے قریب ہوتا ہے وہ امکانی لحاظ سے اس جگہ میں نہیں ہوتا۔ اور اس کا یہ قول کہ مجھے لباس پہنا اور مجھے مزین کر اور مجھے بلند فرما یہ اس چیز کی حقیقت پر دلالت کرتا ہے جس کا اس کے وجدان نے احساس کیا ہے اور وہ کامیابی سے صرف اسی قدر ہمکنار ہوا ہے جس قدر کہ ظاہر ہے[2]

حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص بھی جنید کی بیان کردہ تشریح کو سمجھ نہیں سکتا۔ ہاں جو لوگ صوفیاء کے عقائد سے واقف ہیں اور ان کے نظریات کی معرفت رکھتے ہیں۔ ان کی نظروں سے حقائق مخفی نہیں رہ سکتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جنید بغدادی کی بیان کردہ تشریح کریں کہ قارئین کو اصل حقائق سے آگاہی حاصل ہو جائے۔ اور صوفیاء کے باطل نظریات کھل کر سامنے آجائیں۔

---

[1] اللمع ص ۴۶۱ [2] اللمع ۴۶۱

جنید کے کلام کی وضاحت

جنید بغدادی نے اپنے رفیق ابویزید بسطامی کے بارے میں اپنی فیصلہ کن رائے پیش کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ وہ ابھی تک فردیت کی کامل حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکا ہے اور فردیت سے مراد یہ ہے کہ ہر صوفی کا یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ صرف ایک فرد کو زندگی حاصل ہے اور وہ اللہ ہے۔ البتہ اس کے وجود کے مظاہر متعدد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جنید بغدادی نے ابویزید پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کا کلام تو ایسے انسان کا کلام ہے جس کو خداوند تعالیٰ نے فردیت کے حقائق سے ہمکنار نہیں کیا یعنی اس کی نظر میں اللہ کے علاوہ دوسرا نہیں ہونا چاہیے۔ جیسا کہ حلاج صوفی کا کلام پہلے گذر چکا ہے۔ ذرا آگے چل کر جنید بغدادی نے ابویزید بسطامی کے بارے میں یہ بھی کہا ہے کہ اگر وہ فردیت کی حقیقت سے آشنا ہو جاتا تو اسے قطعاً اس بات کی ضرورت نہ تھی کہ وہ اپنے رب سے انانیت کا سوال کرتا اور احدیت کے مقام پر فائز ہونے کی درخواست کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے ذہن میں ابھی تک وحدت الوجود کا نظریہ متحقق نہ ہوا تھا۔ اس نظریے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان اسی بات کی صحت پر یقین رکھتا ہے کہ وہ خود اللہ ہے۔ لیکن ابویزید بسطامی ابھی تصرف کی اس منزل سے ہمکنار نہ تھا۔ ہاں اس کے قرب و جوار میں جولانی کر رہا تھا۔

جنید بغدادی کے قول کی مزید تشریح یہ ہے کہ جب ابویزید بسطامی نے یہ کہا کہ اے اللہ مجھے اونچا مقام عطا فرما اور مجھے زیب و زینت دے تو اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصل حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکا۔

غور کیجیے جنید بغدادی جو کہ صوفیاء کی جماعت کے رئیس کہلاتے ہیں جب مسئلہ توحید

میں ان کا یہ حال ہے۔ تو پھر دیگر صوفیاء کے بارے میں ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔

اذا کان رب البیت بالطبل ضاربًا

فلا تلم الاولاد فیہ علی الرقص

پھر اس میدان میں امر توحید کے منافی نظریات میں جنید بغدادی ہی منفرد نہیں ہیں بلکہ مشہور متصوف شبلی جنہیں صوفیاء میں منفرد مقام حاصل ہے وہ بھی جنید بغدادی سے پیچھے نہیں رہے۔ چنانچہ شبلی سے ابو یزید بسطامی کے بارے میں سوال ہوا اور انہیں بتایا گیا کہ ابو یزید نے خداوند تعالیٰ سے مقام احدیت کی حقیقت پر فائز ہونے کا سوال کیا تو شبلی نے کہا اگر ابو یزید بسطامی آج ہمارے دور میں ہوتا تو ہمارے شاگردوں کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرتا اور مسلمان ہو جاتا یعنی اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگتا۔ نیز میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی شخص میری باتوں کو سمجھتا ہے تو میں یہود و نصاریٰ کا مخصوص لباس پہننے کے لئے تیار ہوں لیکن کوئی نہیں جو میری بات کو سمجھ سکتا ہو۔ خیال کیجئے کہ شبلی نے ابو یزید کو اپنا شاگرد بھی بنانا گوارا نہیں کیا ہے۔ جب اس نے یہ کہا اگر آج وہ موجود ہوتا تو وہ ہمارے شاگردوں کا شاگرد ہوتا اور مسلمان ہو جاتا مقصد شبلی کا یہ ہے کہ اسلام یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی چیز موجود نہیں۔ اور شبلی کا یہ کہنا کہ کوئی شخص میری باتوں کو سمجھ نہیں سکتا اس کا مطلب یہ ہے کہ شبلی کے ہمعصر علماء جو توحید کے پرچم کو بلند کیے ہوئے تھے تقویٰ اللہ کے رسول کی محبت سے سرشار تھے۔ شبلی کے خیال میں وہ لوگ حق پر نہیں اور انہوں نے لوگوں کو باطل راہ پر لگا لیا ہے۔

شبلی کی ان باتوں پر ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے البتہ سابقہ اوراق میں آپ معلوم

کر چکے ہیں کہ شبلی بھاری بھرکم جسم والا تھا اور اپنے بارے میں کہتا ہے کہ وہ لوہے کی سلاخوں کو گرم کرتا ہے اور آنکھوں میں لگاتا ہے تاکہ نیند نہ آئے کیا اس قدر تقشف کی زندگی بسر کرنے والا انسان بھاری بھرکم رہ سکتا ہے؟

ان تصریحات کے بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ قارئین معلوم کر سکیں کہ صوفیاء کے عقائد کیا ہیں۔ اور جو صوفی اپنے آپ کو خدا نہیں کہتا اس کو صوفیاء کی جماعت سے نکال دیا جاتا ہے ہمیں ان باتوں سے کبھی تعجب نہیں ہوا اس لیے کہ ہمارے سامنے صوفیاء کے اقوال اور ان کے حالات موجود ہیں۔ چنانچہ یہی شبلی جب ابوعبداللہ بن جابان سے ملاقات کرتا ہے اور ملاقات کے بعد واپس روانہ ہوتا ہے تو اس سے کہتا ہے کہ آپ جہاں کہیں بھی ہوں گے میں آپ کے ساتھ ہوں اسی طرح تم بھی میرے پاس ہو اور میری حفاظت میں ہو۔ اللمع ص (۴۷۸)

کچھ لوگ یہ خیال رکھتے ہیں کہ تصوف میں جنید بغدادی کا مقام شبلی سے فروتر تھا لیکن ان کی یہ بات ان کی کم علمی اور غفلت کا نتیجہ ہے۔ اگر وہ صوفیاء کے حالات کا جائزہ لیتے اور ان کے اسرار پر مطلع ہوتے تو کبھی ایسا خیال نہ رکھتے حقیقت یہ ہے کہ جنید بغدادی تمام صوفیاء سے گوئے سبقت لے گیا ہے۔ اور تصوف کے عقائد کے علم میں ان سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ شبلی نے اس سے سوال کیا آپکی اس انسان کے بارے میں کیا رائے ہے۔ جو اللہ کو ایک حقیقت قرار دیتا ہے۔ جنید نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ابھی آپ تصوف کے مقام سے دس ہزار مقام نیچے ہیں تصوف کی پہلی سیڑھی یہ ہے۔ جس نظریے کو تو نے ظاہر کیا ہے۔ اس نظریہ کو ختم کیا جائے یعنی اللہ کی کچھ حقیقت نہیں۔ اللمع ص ۴۸۷

جنید کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اللہ پاک کے بارے میں جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ پاک ان کے تمام معاملات میں ان کی معاونت کرتا ہے اور کافی ہوتا ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ جنید اسلام کی سچی حقیقت کا انکار کر رہا ہے۔ اور مقام توحید سے بغاوت کر رہا ہے۔ اسلام میں یہی عقیدہ بنیادی عقیدہ ہے کہ اللہ موجود ہے اور وہ عظمت والا ہے اور اپنے بندوں کی امداد کرتا ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے۔

الیس اللہ بکاف عبدہٗ ویخوفونک بالذین من دونہٖ

کیا خدا اپنے بندے کو کافی نہیں ہے۔ اور یہ تم کو ان لوگوں سے جو اس کے سوا ہیں (یعنی غیر خدا سے) ڈراتے ہیں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب بیان کیا گیا کہ قریش عزم کر چکے ہیں کہ وہ اُحد کے بعد دوبارہ حملہ آور ہوں گے اور مسلمانوں کا استیصال کر دیں گے اس پر آپ نے فرمایا (حسبنا اللہ ونعم الوکیل) یعنی اللہ ہمیں کافی اور وہ ہمیں نجات دینے والا ہے۔ تعجب ہے کہ کس طرح جنید بغدادی نے ایک واضح حقیقت کا انکار کیا۔ اور کس قدر جرأت کے ساتھ کہا کہ تصوف کی پہلی منزل ہی ہے کہ حقیقتِ شرعیہ کو کالعدم قرار دیا جائے۔

وحدت الوجود صوفیاء وحدت الوجود سے مراد یہ لیتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ کوئی چیز موجود نہیں ہے اور جو کچھ ہمیں نظر آرہا ہے یہ اسی حقیقت کے مظاہر ہیں جس کا نام اللہ ہے (تعالیٰ اللہ عن ذلک علواً کبیرا) پس وہ صاف صاف اس عقیدے کا برملا اظہار کرتے ہیں کہ مختلف قسم کے مظاہر اور متنوع

قسم کے ھیولیٰ جو عالم رنگ و بو میں نظر آ رہے ہیں۔ وہ سب اللہ ہیں۔ آپ معلوم کر چکے ہیں کہ حلاج صوفی نے کس قدر دلیری اور جرأت کے ساتھ صاف صاف لفظوں میں وحدت الوجود کے نظریے کا اظہار کیا۔ اور مشہور زمانہ صوفی شبلی نے گھبراہٹ کے عالم میں کھلے لفظوں میں ذکر کرنے سے گریز کیا۔ اور جنید بغدادی نے مکمل حزم و احتیاط کے ساتھ اس نظریہ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ ایک دور ایسا گزرا ہے کہ یہ عقیدہ چند مخصوص افراد کا تھا جو تصوف کے میدان میں آخری منزل سے ہمکنار تھے۔ لیکن انھوں نے اپنے دامن کو بچاتے ہوئے خوف و ہراس کے عالم میں اس نظریہ کو واضح الفاظ میں پیش نہ کیا یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام سے وہی شخص حقیقت معلوم کر سکا جو ان کا ہم مشرب تھا۔ اور ان کے رنگ میں رنگا ہوا تھا اور صوفیاء کی پہیلیوں اور رموز و اسرار سے شناسا تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ چھٹی صدی کے آخر اور ساتویں صدی کے آغاز میں ایک شخص اُٹھا جس نے پوری قوت کے ساتھ اس باطل عقیدے کو معاشرے میں پیش کیا۔ اور ہزاروں تمثیلات کے ساتھ اس کی وضاحت کی نیز عقائد اور تصوّرات کے اصولوں پر کچھ تفریعات کا تجسس کیا اور انہیں ڈھونڈھ نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ صرف اسی مسئلہ پر اس نے دس سے زیادہ کتابیں تالیف کیں۔ یہ شخص تاریخ میں محی الدّین ابن عربی کے نام سے پہچانا جاتا ہے جو ۶۳۸ھ ہجری میں فوت ہوا۔ یہ شخص اندلس میں نشو و نما پاتا ہے اور شام کے علاقے کو اپنا مستقر بناتا ہے۔

وحدت الوجود کی اشاعت و تشہیر کی پاداش میں اس پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا اور اسے زندیق ملحد کذاب جیسے بدترین القاب سے نوازا گیا۔ اس کی مساعی

بار آور ہوئیں اور اس کے عقائد کا پرچار کرنے والوں اور اس کی تشہیر کرنے والوں کا ایک گروہ معرضِ وجود میں آیا جنہوں نے ابنِ عربی کو نہایت اونچے مقام پر کھڑا کر دیا جیسا کہ ابن عربی خود اپنے آپ کو مرتبۂ ولایت پر فائز سمجھتا تھا بلکہ اس کا عقیدہ یہ تھا میں خاتم الاولیاء ہوں دینِ اسلام کے احیاء میں مجھ سے زیادہ کسی نے کوئی کام نہیں کیا ہے۔

ابن عربی کے باطل نظریات

ابن عربی کے مزعومات بیان کرتے ہوئے حیرت و استعجاب ہمارے دامن کو تھام لیتی ہے جب کہ ابن عربی اس بات کا مدعی ہے کہ اس کا علم اور اس کی کتابیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بالمشافہ ماخوذ ہیں بلکہ اس نے تمام علوم کو لوح محفوظ سے بلا واسطہ نقل کیا ہے اور وحدت الوجود کے عقیدے کو بڑی بیباکی اور جرأت کے ساتھ پیش کیا ہے البتہ عیاری کے ساتھ اس نے قرآن پاک کی آیات میں تحریف کرنے کی ناپاک کوشش کی۔ مثلاً اس نے دعویٰ کیا کہ قوم ہود جنہیں قرآن پاک میں کافر کہا گیا ہے۔ وہ صراطِ مستقیم پر تھے اور فرعون بھی کامل ایمان والا تھا اسی طرح قوم نوح بھی ایمان دار تھی۔ اللہ پاک نے قوم نوح کو ان کے نیک اعمال کا بدلہ دیتے ہوئے وحدت الوجود کے سمندر میں غرق کیا اور عشق الٰہی کی آگ میں داخل کیا تاکہ انہیں اس میں عیش و آرام حاصل ہو اور ہارون علیہ السلام سے یہ غلطی ہوئی کہ اس نے بنی اسرائیل کو بچھڑے کی عبادت سے روکا حالانکہ بچھڑا خدا تھا اور سچا معبود تھا۔ یا خدا کا عکس تھا۔ اور نوح علیہ السلام کی قوم نے نہایت اچھا کردار ادا کیا جب کہ وہ سواع، یغوث، یعوق، نسر کی عبادت کرنے سے باز نہ آئے اس لیے کہ یہ تمام بُت

ایک خدا کے مظاہر ہیں۔ اور جہنم عذاب کی جگہ نہیں ہے بلکہ اس میں حلاوت اور شیرینی موجود ہے۔ اور انسان پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور اس سے خدا راضی ہوتا ہے اور اللہ پاک کسی چیز کو نہیں جانتا جب تک کہ وہ وجود میں نہیں آجاتیں ظاہر ہے کسی کا وجود ہی علم کا وجود ہے۔ بلکہ ہر چیز کا وجود اللہ کے وجود کا عکس ہے۔

(تعالیٰ اللہ عن ذٰلک)

ابن عربی کی تالیف سے چند باتیں بطور نمونہ کے پیش کی گئی ہیں ان کے علاوہ بھی اس کے ہفوات کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ اس کا دعویٰ کس قدر تعجب خیز ہے کہ اس نے ان تمام باتوں کو بلا کم و کاست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے۔ اور آپ نے ہی حکم دیا ہے کہ ان باتوں کو لوگوں تک پہنچا دیا جائے۔ پھر نہ صرف یہ کہ اس کی زندگی میں بلکہ اس کی زندگی کے بعد بے شمار ایسے لوگ موجود رہے بلکہ اب موجود ہیں جو اس کے نظریات کی نشر و اشاعت میں شبانہ روز کوشاں ہیں۔ ان کے مقابلہ میں اُمت اسلامیہ میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو روزانہ کئی بار اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

ابن عربی کی کتابوں سے ماخوذ اقوال

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ابن عربی کی مختلف تالیفات سے ان کے اقوال کی روشنی میں ان کے نظریات کو بیان کریں چنانچہ ان کی مشہور کتاب فصوص الحکم (جس کو انہوں نے خاتم الاعمال کی حیثیت دی ہے اور ان کے عقائد اس میں شرح و بسط کے ساتھ ذکر کیے گئے ہیں) شروع میں ہی لکھتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو ۶۲۷ھ ہجری میں محرم کے آخری عشرہ میں دمشق کے محروسہ شہر میں دیکھا آپ کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی آپ نے مجھ سے فرمایا یہ کتاب فصوص الحکم ہے۔ آپ اس کتاب کو محفوظ کرلیں اور لوگوں کے سامنے پیش کریں تاکہ لوگوں کو اس سے فائدہ ہو۔ میں نے فوراً عرض کیا کہ میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہوں نیز اولوالامر کی بھی اطاعت کرتا ہوں جس طرح وہ مجھے حکم دیں۔ چنانچہ میں نے آپ کی وصیت کے مطابق خلوص نیت کے ساتھ پختہ ارادہ کرلیا کہ مجھے یہ کتاب لوگوں کے سامنے پیش کرنی چاہیے جیساکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا ہے۔ (الفصوص ص ۴۷ طبع بیروت بالتعلیق ابوالعلا عفیفی)

اس کتاب کے عنوانات ذکر کرنے کے بعد ایک دوسرے مقام میں لکھتے ہیں کہ مجھے جن حدود میں رکھا گیا میں ان میں ہی رہا۔ اور میرے بارے میں جو کچھ حکم دیا گیا میں نے اس کو تسلیم کیا جہاں مجھے کھڑا کیا گیا وہاں میں کھڑا ہو گیا اگر میں اس میں کمی بیشی کا ارادہ کرتا تو یہ ناممکن تھا جلال خداوندی مجھے اس سے مانع تھا (الفصوص ص ۵۸ طبع بیروت بالتعلیق ابوالعلا عفیفی) نیز وہ اپنی اس کتاب کے ایک مقام پر رقمطراز ہے اگر اللہ کی مشیت میرے شامل ہوئی تو میں اس باب میں اوامر الٰہیہ ذکر کروں گا۔ جن کا القاء میرے دل میں ہوتا رہتا ہے۔ اور یہ چند تمہیدی باتیں ہیں جو مجھے بالمشافہ خداوند تعالیٰ سے حاصل ہوئیں (ص ۱۹۷)

ہم بلا جھجک اپنی عادلانہ رائے کا اظہار کرتے ہیں ابن عربی نے مقدمہ میں جن تمہیدی باتوں کا ذکر کیا ہے وہ جھوٹ کا پلندہ ہیں کلام کے بین السطور سے یہ حقیقت واضح ہو رہی ہے۔ کہ ابن عربی ان باتوں کے نقل کرتے میں بڑے شدومد

کے ساتھ اصرار کرتے ہیں کہ مجھے ان کا علم بالمشافہ حاصل ہوا ہے۔ لوح محفوظ سے میں نے ان کو نقل کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے بھی مجھے آگاہی ہوئی اور یہی وہ باتیں ہیں جو آپ کو خواب میں دکھائی گئیں اور آپ نے لوگوں سے کہا کہ میں آپ کے سامنے خواب میں عطا کردہ کتاب پیش کرتا ہوں۔

ذیل میں ہم اس کتاب کے چند اقتباسات قارئین کی ضیافت طبع کے لیے پیش کرتے ہیں۔ ابن عربی قوم نوح کے بارے میں لکھتا ہے کہ اس نے اپنے رسول کی باتوں کو قبول کیا اور جب نوح نے ان کے ساتھ مکر کیا تو لوگوں نے بھی مکر و فریب کا جواب عیاری سے دیا۔ قوم نوح کا متعدد خداؤں کی عبادت کرنا صحیح تھا۔ نوح علیہ السلام نے ان کو اس سے روکنا چاہا لیکن انہوں نے اس کی دعوت کو قبول نہ کیا نوح علیہ السلام نے ان کو اللہ سے مغفرت مانگنے کا حکم دیا لیکن انہوں نے اپنے کانوں کو بند کر لیا اور اپنے آپ کو کپڑوں میں چھپا دیا۔

ابن عربی اس کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کپڑوں سے چھپانے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے ان کے کہنے پر پردے کے مسئلے کو رواج دیا۔ اور نوح علیہ السلام کا اپنی قوم سے یہ کہنا (یرسل السماء علیکم مدرارا) اس سے مراد معارف عقلیہ اور معانی نظریہ ہیں اور (یمدد کم باموال) سے مراد یہ ہے کہ اللہ تم میں اپنی جانب میلان پیدا کرے گا جب تم میں میلان پیدا ہو جائے گا تو تم اس میں اپنی تصویر دیکھو گے۔ پس وہ انسان حقیقت میں عارف ہے جس نے اپنے آپ کو خدا پایا۔ اور جس شخص کا تصوّر یہ ہے کہ اس نے خدا دیکھا ہے یعنی خدا اس کے علاوہ کوئی اور ہے تو وہ عارف نہیں ہے۔ بارش زرخیزی۔ تقویٰ۔ ایمان۔ استغفار

یہ تمام اس کے ہاں معارف عقلیہ ہیں۔ اللہ کے قول (ومکروا مکرا کبارا) کے ضمن میں کہتا ہے کہ دعوت الی اللہ مکر ہے تو جس طرح نوح نے مکر کرتے ہوئے کہا کہ تم نے اپنے خداؤں ود، سواع، یغوث، یعوق، نسر کو چھوڑنا نہیں ہوگا اگر ان کو چھوڑ دیا گیا تو حق کی معرفت حاصل نہ ہوگی۔ اس لیے کہ ہر معبود میں حق موجود ہے۔ معرفت رکھنے والے لوگ ہی اس سے واقف ہیں۔ اور اس سے ناواقفیت رکھنے والے لوگ اس کی معرفت سے عاری ہیں۔ صاف صاف بات یہ ہے کہ لوگ جس معبود کو بھی پوجتے ہیں وہ اللہ ہے اس لیے کہ اللہ کا غیر موجود نہیں (ص ۷۲) گویا کہ ابن عربی نے ان تمام باطل خداؤں کو جن کی عبادت قوم نوح کیا کرتی تھی ان کو حقیقی خدا ٹھہرایا ہے۔

اپنی دلیل کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہوئے بیان کرتا ہے اور آیات کی تحریف کا عجیب و غریب نمونہ پیش کرتا ہے کہ (لا تزد الظلمین الا تبارا) یہ دعا جو نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے کی یعنی نوح علیہ السلام نے یہ دعا کر کے بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ اللہ کے نیک بندوں کو قرآن پاک میں ظالم کا لقب بھی دیا گیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے ثم اورثنا الکتٰب الذین اصطفینا من عبادنا فمنھم ظالم لنفسہ ومنھم مقتصد ومنھم سابق بالخیرات اس قسم کی باتیں ابن عربی کی عیاری کو واضح کر رہی ہیں اور یہ کہ اس نے حق بات کو باطل کے ساتھ خلط ملط کر کے پیش کیا ہے۔ مما خطیئتھم سے مراد یہ ہے کہ وہ معرفت الٰہی کے سمندر میں ڈوب گئے اور انہیں اللہ کے علاوہ کوئی مددگار نہ ملا یعنی اللہ ہی ان کا مددگار رہا۔ اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہے۔ انک ان تذرھم یضلوا عبادک کی تفسیر میں تحریف کرتا ہوا لکھتا ہے اگر تو نے ان کو چھوڑا تو وہ لوگوں کو عبودیت سے نکال کر

اسرار ربوبیت کے بحر بے کنار میں دھکیل دیں گے تو وہ اپنے آپ کو خدا سمجھیں گے۔ جب کہ وہ اس سے پہلے اپنے آپ کو عبد سمجھتے تھے۔ (ص ۴۷)

رب اغفرلی ولوالدی ولمن دخل بیتی وللمومنین وللمومنٰت ولا تزد الظٰلمین الا تبارا کی تفسیر میں یوں رقمطراز ہے کہ اے اللہ مجھے پردے میں پہنچا دے اور والد سے مراد عقل ہے یعنی میری عقل کو بھی پردے میں کر۔ اور بیتی سے مراد قلب ہے اور مومنین سے مراد عقول عشرہ اور مومنات سے مراد نفوس ہیں اور ظالمین سے مراد غیب والے ہیں۔ تو ان کو ظالم اس لیے کہا ہے کہ وہ جلوۂ حق کا مشاہدہ کر رہے ہیں حالانکہ وہ تو خدا ہیں وہ کس خدا کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ جو شخص ان اسرار سے مزید فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ فصوص الحکم کا مطالعہ کرے۔ (ص ۴۷)

ابن عربی نے حضرت نوح کی قوم کے موقف ہی کو صحیح نہیں کہا بلکہ روئے زمین کے تمام کفار کو مومن، موحد، عارف باللہ کہا ہے۔ اور مسلمانوں کو مومن اور کافر بھی کہا ہے۔ اور فرعون جس سے بڑا کوئی کافر نہیں ہے ابن عربی نے اس کو بھی مومنین موحدین کی فہرست میں داخل کیا ہے چنانچہ وہ رقمطراز ہے۔

چونکہ فرعون اپنے دور میں صاحب اقتدار تھا اگرچہ ظالم و جابر تھا دیکھئے اس نے کھلے لفظوں میں اعلان کر دیا کہ تم تمام بھی رب ہو لیکن میں تم سب سے بڑا رب ہوں۔ تم دیکھتے نہیں ہو کہ مجھے تم پر اقتدار حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب جادوگروں نے اس کی حاکمیت اور ربوبیت کو صحیح سمجھا تو انہوں نے صاف صاف کہہ دیا اے فرعون تو تاج و تخت کا مالک ہے۔ حکومت کی باگ ڈور تیرے ہاتھ میں ہے۔ (فاقض ما انت قاض) تو جو کچھ کرنا چاہتا ہے کر سکتا ہے۔ انما تقضی ھٰذہ الحیاۃ الدنیا۔

تو ہماری دنیا کی زندگی کو ختم کرنے پر قادر ہے (الفصوص صفحہ ۲۱۱/۲)

ابن عربی کا فرعون کے بارے میں جو نظریہ تحریر کیا گیا ہے بعینہٖ یہی نظریہ حلاج کا ہے اور وہ شخص جو اقتدار پر متمکن ہے۔ اگرچہ رعایا اس کے ظلم و ستم سے تنگ آچکی ہے۔ پھر بھی وہ ظالم حکمران ابن عربی کے ہاں اللہ کا خلیفہ ہے اور موسیٰ علیہ السلام کو نعوذ باللہ جاہل اور فرعون کو علم والا کہا ہے۔ اس لیے کہ فرعون اللہ کی حقیقت سے متعارف تھا اور موسیٰ علیہ السلام تو صرف ایک ہی راستے کا نشان مہیا کرتا تھا اسے یہ علم نہ ہو سکا کہ تمام کائنات رب ہے۔ اور وہ مخلوق بھی ہے گویا کہ بیک وقت رب اور مخلوق ہے۔ ابن عربی فرعون کو بڑا رب اور اس کے علاوہ سبھی کو چھوٹے رب کہتا ہے۔

فرعون کے ایمان اور نجات پانے پر ابن عربی دلیل پیش کرتا ہے کہ جب بنی اسرائیل کے لیے بحر قلزم میں پانی چلنے سے رک گیا اور راستے بن گئے تو اس نے جب یہ کرشمہ دیکھا تو ایمان لے آیا اللہ پاک نے اس کو اخروی عذاب سے رستگاری فرمائی اور وہ لوگ غلطی پر ہیں جو کہتے ہیں کہ فرعون کو عذاب ہوگا اس پر کوئی نص موجود نہیں ہے۔ ابن عربی کے فرعون کے بارے میں یہ نظریات بالکل بوگس ہیں اور انہیں صحیح نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآن پاک فرعون کو ملعون اور جہنمی قرار دیتا ہے ارشاد خداوندی ہے۔ ولقد ارسلنا موسیٰ بآیٰتنا وسلطٰن مبین الی فرعون وملائه فاتبعوا امر فرعون۔ وما امر فرعون برشید۔ یقدم قومه یوم القیٰمة فاوردهم النار وبئس الورد المورود واتبعوا فی هذه لعنة ویوم القیٰمة بئس الرفد المرفود (هود ۹۶-۹۹)

یقیناً قرآن پاک کی مذکورہ نص سے ابن عربی جاہل نہیں ہے۔ چونکہ وہ انسان عیار، دجال اور مسلمانوں کی مخالفت کرنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے۔ اس لیے اگر

وہ اس قسم کی باتیں کرتا ہے تو کچھ تعجب نہیں۔

جس طرح ابن عربی نے فرعون کے موقف کو صحیح قرار دیا۔ اسی طرح سامری کے موقف کو بھی درست قرار دیتا ہے۔ جس نے بنی اسرائیل کے لیے بچھڑا بنایا اور انہیں فتنے میں ڈالا۔ بنی اسرائیل نے اس کی پوجا شروع کر دی ابن عربی حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی غلط کار کہتا ہے کہ اس کو بھی حق معلوم نہ ہو سکا جب کہ اس نے خدائی کو ایک خدا میں بند کر دیا حالانکہ ساری مخلوق خدا ہے۔ تعالیٰ اللہ عن ذلك علوا كبيرا۔

ابن عربی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ میں ڈر گیا کہ تو نے بنی اسرائیل کے درمیان اختلاف پیدا کر دیا اور تو مجھے ان کے اختلاف کا باعث سمجھے گا۔ حالانکہ بچھڑے کی عبادت نے ان میں اختلاف کو جنم دیا تو ان میں سے کچھ لوگ وہ تھے جو سامری کی اتباع کرتے ہوئے بچھڑے کی عبادت کر رہے تھے۔ اور کچھ لوگ وہ تھے جنہوں نے حضرت موسیٰ کے آنے تک بچھڑے کی عبادت سے کنارہ کیا۔ جب وہ آئے گا تو اس سے دریافت کریں گے۔ ہارون نے خطرہ محسوس کیا کہ کہیں ان کے باہمی اختلاف کو اس کی طرف منسوب کر دیا جائے اور موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام خوب جانتے تھے کہ بچھڑے کی عبادت کرنے والوں نے اللہ کی تقدیر کے مطابق اس کی عبادت کی ہے۔ اور اللہ جس بات کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ وہ واقع ہو کر رہتی ہے۔ پس موسیٰ علیہ السلام کا اپنے بھائی ہارون پر ناراض ہونا اس لیے تھا کہ اس نے انکار کیوں کیا۔ اور موافقت کیوں نہ کی اس لیے کہ عارف تو ہر چیز میں خدا کو دیکھتا ہے بلکہ ہر چیز عین خدا ہے (الفصوص ص ۱۹۲)

غور کیجئے ابن عربی کس قدر بے باکی کے ساتھ تحریف کرتا ہے جب وہ لکھتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو علم تھا کہ بچھڑے کی عبادت کرنے والے دراصل اللہ کی عبادت کرنے والے ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ وقضی ربك الا تعبدوا الا ایاہ کہ تیرے رب نے تقدیر میں لکھ دیا ہے کہ تم نے اللہ ہی کی عبادت کرنی ہے۔ پس جب ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ کے فیصلے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ تو جس چیز کی بھی عبادت ہو رہی ہے وہ اللہ ہے جب انسان کسی درخت یا پتھر وغیرہ کی عبادت کرتا ہے تو وہ اللہ ہی کی عبادت کرتا ہے لیکن ابن عربی کا بیان کردہ مفہوم بالکل غلط ہے۔ جب کہ ہر عقل مند آدمی اچھی طرح جانتا ہے کہ مذکورہ آیت میں قضا کا معنی یہ ہے کہ اللہ نے تشریعی حکم دیا ہے۔

پس جس کو ہدایت حاصل ہو گئی اور توفیق مل گئی وہ اللہ کا حکم تسلیم کرتا ہے اور جو شخص شیطان کے پیچھے لگا وہ سیدھے راہ سے بھٹک گیا۔ اسی طرح دیگر تشریعی امور کے بارے میں یہی فیصلہ دیا جائے گا۔ مثلاً واقیموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ اور اسی طرح وما کان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم سے بھی اوامر شرعیہ مراد ہیں۔ اگر یہ تکوینی امور ہوتے تو کسی کو مخالفت کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ حالانکہ ان احکام اور امور کی مخالفت کرنے والے کفار، ملحدین کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اسی طرح بعض ایماندار بھی اللہ کے بعض احکام کی مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن تکوینی اور تقدیری امور کی مخالفت کوئی نہیں کر سکتا۔ نیز ابن عربی اپنے باطل عقیدے کی تشریح کرتے ہوئے۔ فما خطبك یا سامری اللہ کے قول کے معنی کی تحریف کرتا ہے یعنی موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے کہا کہ تو نے خاص طور پر بچھڑے کو معبود

کیوں بنایا ہے ۔ حالانکہ صحیح عقیدہ یہ ہے کہ ہر چیز اللہ ہے یہی وجہ ہے کہ موسیٰؑ نے بچھڑے کو جلا دیا تاکہ خدائی صرف بچھڑے میں محصور نہ ہو جائے ۔

ابن عربی مسلسل اس قسم کی تحریفات کا مرتکب ہوتا ہے اور وانظر الی الٰھک کی تشریح یوں کرتا ہے کہ موسیٰ علیہ السّلام نے بچھڑے کو معبود تسلیم کر لیا تھا اور تنبیہ کرتے ہوئے اس بات سے پردہ کشائی کرتا ہے ۔ کہ یہ بھی خدا ہے ۔ اس قسم کی باتوں کی نسبت موسیٰ علیہ السّلام کی طرف کرنا بہت بڑی دلیری اور گستاخی ہے ۔ سبحٰنک هذا بهتان عظيم كبرت كلمة تخرج من افواههم ان يقولون الا كذبا ابن عربی اس بات کا فلسفہ بیان کرتا ہے کہ کیوں ہارونؑ کو بچھڑے کے جلانے پر قدرت حاصل نہ ہوئی ۔ اور موسیٰ علیہ السّلام کو قدرت حاصل ہو گئی اس لیے کہ موسیٰ علیہ السّلام ہر صورت میں خدا کی عبادت کرتا تھا لیکن ہارون علیہ السّلام صرف بچھڑے کو خدا مانتا ہے ۔

نیز رفیع الدرجات کی تشریح یوں کرتا ہے کہ اللہ کے لیے کچھ درجات ہیں جن میں اللہ کی عبادت ہوتی ہے اور ہر بت جس کی زمین میں عبادت ہوتی ہے ۔ وہ بھی اللہ کے درجات میں سے ایک درجہ ہے ۔ نیز اپنی خواہش کی عبادت کرنا عظیم درجہ ہے ۔ تعالی اللہ عن ذٰلك ۔

نیز ابن عربی کہتا ہے کائنات میں جس چیز کی عبادت ہوتی ہے ۔ عبادت کرنے والوں کے نزدیک اس کو رفعت حاصل ہوتی ہے اور ان کے دلوں میں اس کا درجہ اونچا ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ رفیع الدرجات جمع کے ساتھ آیا ہے ۔ واحد کے ساتھ نہیں آیا ۔ اس کا صاف صاف مطلب یہ ہے ۔ کہ اللہ کی عبادت مختلف درجات میں کی جائے اور ہر درجہ میں اللہ کی تجلی موجود ہے ۔

اور سب سے اونچا درجہ خواہش نفسانی کا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔
افرءیت من اتخذ الٰہہ ھواہ   اس میں بتایا گیا ہے کہ خواہش نفسانی بہت بڑا معبود ہے۔ اس لیے کہ جس چیز کی بھی عبادت کی جاتی ہے اس میں خواہش نفسانی کو دخل ہوتا ہے، چنانچہ اس کی عظمت کے پیشِ نظر ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

وحقِ الھوی ان الھوی سبب الھوی	خواہش نفسانی کے خدا ہونے کی قسم یقیناً خواہش
ولولا الھوی فی القلب ما عبد الھوی	نفسانی تمام عزائم کا سبب ہے۔ اگر دل میں خواہش
(الفصوص ص۱۹۴)	نفسانی نہ ہوتی تو کبھی اس کی پوجا نہ ہوتی۔

مزید وہ کہتا ہے کہ کامل عارف وہ ہے جو ہر چیز میں خدا کا جلوہ دیکھتا ہے۔ اور اس کی عبادت کرتا ہے، اگرچہ بظاہر نام کے لحاظ سے اسے آپ حجر یا شجر، حیوان یا انسان، سیارہ یا بادشاہ کہہ لیجئے حقیقت میں وہ عین خدا ہے۔ ابن عربی کفار قریش کے بارے میں اس رائے کا اظہار کرتا ہے۔ کہ انہوں نے اپنے باطل خداؤں کے ساتھ اپنے تعلقات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم تو ان کی محض اس لیے پوجا کرتے ہیں تاکہ ہمیں اللہ کے قریب کریں۔ ہم اللہ کا انکار کرنے والے نہیں ہیں۔ البتہ انہیں اس بات پر اصرار تھا کہ یہ انسانی شکلوں پر بنائے ہوئے بُت خدا ہیں۔

ابن عربی مزید کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو معروف خدا کی طرف دعوت دی لیکن وہ خدا ظاہر نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی طرف اپنی ضرورتوں کو فی الجملہ لے جایا جاتا ہے۔ چونکہ وہ دکھائی نہیں دیتا۔ اور لطیف ہونے کی وجہ سے اشیاء کے اعیان میں چھپا ہوا ہے۔ آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ جیسا کہ ارواح کا ادراک نہیں کر سکتیں وہ لطیف اور باخبر ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہے۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس نے اس نظریہ کو حضرت [illegible] اپنے معتقدین کا نظریہ نہیں کہا ہے بلکہ اس کا نزول [illegible] سے آنحضرت [illegible] حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام رسولوں کا دینی عقیدہ تھا نیز فصوص الحکم کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بطور عطیہ کے دی ہے تاکہ لوگوں کو دین حق سے آشنا کرایا جائے۔ اب وہ لوگوں کے سامنے صرف اسی کتاب کا متن درس دے رہا ہے۔ نہ اس میں کمی کر رہا ہے اور نہ ہی اس میں ایک حرف کا اضافہ کیا ہے۔ اس میں بیان کردہ ماموریات کو بلا کم وکاست لوگوں کے سامنے پیش کر رہا ہے نہ اس دور کے لوگ اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم میں اتنی استطاعت نہیں ہے کہ ہم ابن عربی کو گمراہ کن نظریات سے باز رکھ سکیں اور صحیح عقائد کی جانب اس کا میلان کر سکیں۔ وہ تو تلبیسات کے میدان میں آخری سرحد پر کھڑا ہے۔

اسلام کے مسلمہ عقاید جہنم وغیرہ کے بارے میں نصوص صریحہ موجود ہیں۔ لیکن وہ ان تمام نصوص کو غلط رنگ میں پیش کرتا ہے اور کھلے لفظوں میں جہنم کو بدبختی اور عذاب کا گھر قرار نہیں دیتا بلکہ کہتا ہے وہ تو سرشاری اور حلاوت وشیرینی کا

گہوارہ ہے۔ اور جہنمی خوشگوار زندگی بسر کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے نہ صرف قوم نوح۔ قوم فرعون۔ کفار مکہ کو مومن کہا ہے۔ بلکہ روئے زمین کے تمام کفار کو وہ مومن قرار دیتا ہے۔ اس لیے کہ وہ کسی نہ کسی شکل میں اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ چنانچہ جہنم کی خوشگواری کے بارے میں اس کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

وان دخلوا دار الشقاء فانھم	جب وہ جہنم میں داخل ہوں گے تو وہاں مخالف
علی لذۃ فیھا نعیم مباین	نعمتوں کی لذت میں ہوں گے ہمیشہ ہمیشہ جنتوں کی
نعیم جنان الخلد فالامر واحد	نعمت میں رہیں گے۔ وہ ایک ہی حالت پر ہوں گے
وبینھما عند التجلی تباین	البتہ بظاہر ان میں (جنت دوزخ) کے درمیان
یسمی عذابا من عذوبۃ طعمہ	تباین ہوگا۔ جہنم کا نام عذاب اس لیے رکھا گیا
وذاک لہ کالقشر والقشر صاین	ہے کہ وہاں کی نعمتوں کا ذائقہ شیریں ہوگا۔ یوں سمجھئے
	جس طرح چھلکا مغز کے لیے مدافعت کرنے والا
	ہوتا ہے اسی طرح بظاہر جہنم ایک چھلکے کی مانند ہے

غور کیجئے کہ ابن عربی نے کس قدر بے شرمی اور ڈھٹائی سے دوزخ کی نعمتوں کو جنت کی نعمتوں کے مماثل قرار دیا ہے۔ اس کے خیال میں دونوں ایک ہیں۔ اور عذاب کا اشتقاق عذوبۃ سے ہے۔ جس کا معنی حلاوت و شیرینی ہے۔ اور آگ ایک پردہ ہے۔ جس کے جلوہ میں جہنمیوں کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کی نعمتیں حاصل رہیں گی۔ نیز وہ کہتا ہے کچھ ایسے بندگان خدا بھی ہوں گے جن کو اخروی زندگی میں تکالیف سے دوچار ہونا ہوگا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اہل علم میں سے کوئی شخص بھی یقین کے ساتھ یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ وہاں وہ اللہ کی عنایات خصوصی

سے محروم ہوں گے بلکہ اگر حقائق سے پردہ کشائی کی جائے تو یہ بات کہنے کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ وہ مصائب کے احساس سے محفوظ ہوں گے۔ بلکہ جس طرح اہل جنت خوشیوں اور شادمانیوں سے ہمکنار ہوں گے اسی طرح وہ بھی ہمیشہ کی نعمتوں میں رہیں گے۔

ہم ابن عربی کے ان ہفوات پر کچھ کہنا نہیں چاہتے معمولی بصیرت رکھنے والا انسان بھی ان چیزوں کو صحیح قرار نہیں دے سکتا۔ (نعوذ باللہ من الخذلان) مزید اپنے موقف کو ثابت کرتے ہوئے۔ اذعان و یقین کے ساتھ اس بات کو دہراتا ہے کہ جہنمیوں پر آگ یقیناً ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو گی۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو گئی تھی۔ نیز فصوص الحکم کے ص ۱۶۹ میں لکھتا ہے۔ جہنمی بظاہر دوزخ میں ہوں گے۔ لیکن انجام کار وہ نعمتوں میں ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ جب سزا کی مدت ختم ہو جائے گی تو آگ کا ٹھنڈا ہونا بدیہی ہے۔ اور یہی جہنم ان کے حق میں جنت ثابت ہو گی۔ چنانچہ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے بھڑکتی ہوئی آگ کا منظر دیکھا اور انہیں اس کی شدت کا احساس ہوا۔ اور ان کے ذہن میں یہ تصور یقین کی شکل اختیار کر گیا۔ کہ یہ میرے لیے بڑا ابتلاء ہے۔ اور پھر عملاً انہیں اس میں گرایا گیا تو وہ عذاب نعمت کی شکل اختیار کر گیا۔

ہم قارئین سے بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ انہیں صوفیاء کے باطل عقائد سے معرفت حاصل ہو گئی ہو گی۔ مزید وضاحت کے لیے ابن عربی کے اپنے کلام سے واضح بیان پیش کرتے ہیں۔ ابن عربی جسے عام طور پر الشیخ الاکبر کا

لقب دیا جاتا ہے۔ دراصل اسے الشیخ الاکفر کہنا چاہیئے۔ اس لیے کہ اس کے عقائد جیسا کہ سابقہ اوراق میں گذر چکے ہیں۔ کافرانہ عقائد ہیں۔ ہم ان کے ابطال کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتے ہیں۔ صرف اس قدر اکتفا کرتے ہیں کہ تاریخِ عالم میں اتنا بڑا الحاد اور کفر دیکھنے میں نہیں آیا۔ اللہ پاک نے قرآن پاک میں ان لوگوں کے قول کو بہت ہی معیوب قرار دیا ہے۔ جو اللہ کی اولاد ثابت کرتے ہیں۔ چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے۔

وینذر الذین قالوا اتخذ اللہ ولداً ما لھم بہ من علم ولا لآبائھم کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذباً

اور ان لوگوں کو ڈراتے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنا لیا ہے۔ ان کو اس بات کا کچھ علم بھی نہیں۔ اور نہ ان کے باپ دادا کو ہی تھا۔ یہ بڑی سخت بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے (اور کچھ شک نہیں) کہ یہ جو کچھ کہتے ہیں محض جھوٹ ہے۔

نیز ارشادِ خداوندی ہے۔

وقالوا اتخذ الرحمٰن ولداً لقد جئتم شیئاً اداً تکاد السمٰوٰت یتفطرن منہ وتنشق الارض وتخر الجبال ھداً ان دعوا للرحمٰن ولداً وما ینبغی للرحمٰن ان یتخذ ولداً ان کل من فی السمٰوٰت والارض الا اٰتی الرحمٰن عبداً لقد احصٰھم وعدھم عداً وکلھم اٰتیہ یوم القیامۃ فرداً۔

اور کہتے ہیں کہ خدا بیٹا رکھتا ہے (ایسا کہنے والو یہ تو تم بری بات زبان پر لاتے ہو۔ قریب ہے اس افترا سے آسمان پھٹ پڑیں۔ اور زمین شق ہو جائے۔ اور پہاڑ پارہ پارہ ہو کر گر پڑیں گے۔ کہ انہوں نے خدا کے لیے بیٹا تجویز کیا اور خدا کو شایاں نہیں کہ کسی کو بیٹا بنائے۔ تمام شخص جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سب خدا کے روبرو بندے ہو کر آئیں گے۔ اس نے ان سب کو اپنے علم سے گھیر رکھا ہے۔ اور سب قیامت کے دن

اس کے سامنے اکیلے اکیلے حاضر ہوں گے۔

غور کیجیئے جب خدا کی اولاد ثابت کرنے والوں کے لیے اللہ پاک کا غیظ و غضب اس قدر مشتعل ہے۔ کہ جس کی تصویر مذکورہ آیات میں کی گئی ہے۔ قریب ہیں کہ آسمان پھٹ جائیں۔ زمین میں دراڑیں نمودار ہو جائیں۔ اور پہاڑ دھڑام سے گر پڑیں۔ کہ کیوں اس قسم کے عقیدے کا اظہار کیا گیا ہے۔ تو اس شخص پر اللہ کی ناراضگی کا تصور کیا ہو سکتا ہے۔ جو زمین ہر خبیث چیز کو اللہ کی ذات کی طرف منسوب کرتا ہے۔ بلکہ اسے اللہ کا عین قرار دیتا ہے۔ جن لوگوں نے اللہ کی اولاد ثابت کی تھی۔ انہوں نے پیغمبروں اور فرشتوں کو اس طرح کیا تھا لیکن یہ انسان تو ہر خبیث سے خبیث چیز کو اللہ کا عین قرار دیتا ہے۔ تو جب آسمان اس خبیث قول سے پھٹنے کے قریب ہو جاتے ہیں۔ بلکہ زمین میں دراڑیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ اور پہاڑ دھماکے سے گر جاتے ہیں۔ تو کیوں نہ ہو جب ہر خبیث چیز کی نسبت اللہ کی طرف کردی جائے۔ بلکہ اس چیز کو اللہ کا عین قرار دے دیا جائے۔

پس وہ لوگ جو اللہ کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہیں۔ وہ کسی حد تک ایک صالح چیز کی نسبت کر رہے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو ہر اچھی بری چیز کو اللہ کا عین قرار دے رہے ہیں ان کی بات یقیناً آسمان زمین اور پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دینے والی ہے۔ ان لوگوں کا یہ نظریہ باطل ہے۔ معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا انسان اس کو غلط قرار دیتا ہے۔ اور اسے معقولیت کے خلاف سمجھتا ہے۔ اور اس باطل نظریے کے اظہار پر شرمندگی اور ندامت محسوس کرتا ہے۔ اس قسم کے نظریات کا اختراع کرنے والے شیطان اپنے آپ کو بچانے کے لیے برملا اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ ہماری باتیں بہت اونچی ہیں۔ کوئی بے ذوق آدمی ہماری باتوں کو سمجھ نہیں سکتا صرف وہی لوگ اس کی معرفت رکھتے ہیں۔

جن میں ہمارے جیسا شوق جذب اور مستی موجود ہے۔ ہم ان کے بلند بانگ دعاوی پر اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہیے۔ کہ یہ لوگ علم وفضل سے آشنا نہیں ہیں۔ ان کا علمی ذوق مُردہ ہوچکا ہے۔ اوران میں کچھ عمدگی موجود نہیں ہے۔ ان کی تمام باتیں ضلالت اور گمراہی پر مبنی ہیں۔ اور غلبۂ حال کی رہینِ منت ہیں۔ ان کے غلط نظریات اور عقائد یونانی فلسفہ سے ماخوذ ہیں۔ اوران کی بیسیوں کتابوں میں یہ نظریات بالتفصیل موجود ہیں۔ انہوں نے حیثیتِ باطن کی بنا، پر قرآنِ پاک کی تمام آیات کو بدل دیا ہے انکی روشنی میں مسلمانوں کے عقائدِ صحیحہ کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں خصوصاً اللہ سبحانہ کے بارے میں مسلمانوں کے اجتماعی عقیدے کو ٹھیس پہنچا رہے ہیں مسلمانوں کے ہاں اللہ کی ذات تمام صفاتِ کمال سے متصف ہے۔ وہ اپنی مخلوق میں سے کسی کے ساتھ کچھ مشابہت نہیں رکھتا۔ وہ اللہ ایک ہے تنہا ہے۔ بے نیاز ہے نہ اس نے کسی کو جنا ہے۔ نہ وہ خود جنا گیا ہے۔ اوراس کی کوئی برابری کرنے والا نہیں۔

ابنِ عربی اور حدیث: من عرف نفسہ فقد عرف ربہٗ۔

ابنِ عربی اپنے عقیدے کی تشریح کرتا ہوا مذکورہ حدیث سے استدلال کرتا ہے۔ حالانکہ یہ حدیث موضوع ہے۔ ابنِ عربی اس بات کا مدعی ہے کہ اللہ کے بارہ میں تمام مخلوق سے اسے زیادہ علم ہے بعض فلاسفہ اور امام غزالی بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ابنِ عربی اللہ کی معرفت میں کائنات پر نظر ڈالنے کا محتاج نہ تھا۔ ان کی یہ بات سراسر غلط ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی ذات جو ازلی ہے۔ اس کی معرفت کائنات کے وجود سے معلوم ہوتی ہے۔ اور کائنات کا وجود اللہ کی ذات پر دلیل ہے۔ پھر اس کے بعد اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ کی ذات

ہی اللہ کی ذات اور اس کے معبود ہونے پر دلیل ہے اور تمام عالم اس کی تجلیات کا مظہر ہے۔ اور اس کا وجود اللہ کے وجود کے بغیر محال ہے۔ اللہ کا تصوّر عالم کے حقائق اور احوال کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب ہم اسے معبود سمجھ لیتے ہیں۔ تو ہماری شکلیں خدا کا روپ دھار لیتی ہیں۔ اس طرح شکلوں کے لحاظ سے ہم ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں۔ ص ۸۱، ۸۲

اس مقام پر ابن عربی نے امام غزالی اور دیگر بعض صوفیاء کی باتوں کا ردّ کیا ہے۔ جن کا یہ دعویٰ تھا کہ اللہ کی معرفت کے لیے کائنات میں غور و فکر کرنا ضروری نہیں۔ بلکہ اللہ کی ذات کی معرفت بصورت کشف حاصل ہوتی ہے اور کائنات کے ساتھ استدلال کرنے کی ہم ضرورت محسوس نہیں کرتے ہیں۔ لیکن ابن عربی اللہ کی ذات ازلی کی معرفت کے لیے کائنات میں غور و فکر کو لازمی قرار دیتا ہے۔

مزید وضاحت کرتے ہوئے ابن عربی کہتا ہے کہ آنکھ جس چیز کا مشاہدہ کر رہی ہے۔ وہی خدا ہے اور وہ خدا کے وجود پر دلیل ہے۔ اور خود انسان کا وجود اللہ کی شکل ہے۔ اور جب انسان اپنے آپ کو اللہ کی شکل سمجھ لیتا ہے تو اس نے اپنے آپ کو پہچان لیا۔ اور اسے جب اپنی پہچان حاصل ہو گئی تو اسے اللہ کی پہچان حاصل ہو گئی۔ یعنی اللہ کی معرفت یہ ہے کہ ہر موجود چیز خدا ہے۔

اس گروہ میں سے ابن عربی کا انداز دوسروں سے نرالا ہے۔ وہ اسلام کے عقائد حقہ پر نہ صرف یہ کہ بھرپور تنقید کرتا ہے بلکہ ان کا مذاق اڑاتا ہے۔ اور انہیں حقارت آمیز نظروں سے دیکھتا ہے۔ اور ایمان دار لوگوں کو ذلیل تر مانتے ہوئے ان کے خلاف بھرپور حملے کر رہا ہے۔

مثال اللہ کے اسماء میں سے علی ایک اہم ہے۔ سلف صالحین اس سے مراد اللہ کا حقیقی علو لیتے ہیں۔ جو اس بات کو مستلزم ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے الگ ہے۔ جب کہ علوِ مجازی سے مراد مرتبے کا اونچا ہونا ہے۔ پس اللہ کے بُلند ہونے کا یہ معنیٰ ہے کہ اللہ پاک عرش پر بلند ہیں۔ اور عرش کو کائنات کی چھت سمجھیئے۔ قرآن پاک کی تقریباً سات آیات میں اللہ پاک نے اپنی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ عرش پر ہے۔

امام مالک کا قول الاستواء معلوم والکیف مجھول والسوال عنہ بدعۃ اللہ کا عرش پر مستوی ہونا معلوم ہے۔ اس کی کیفیت مجہول ہے اور اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔ پس اللہ کا مقام اور مرتبہ تمام سے بُلند ہے کہ وہ ذات عظمت والی ہے۔ پاک ہے۔ قدرت والی ہے۔ اور کائنات کی خالق ہے۔ اور اللہ کے علاوہ تمام چیزیں اللہ کی پیدا کردہ ہیں۔ اور اللہ کی قدرت کے سامنے مغلوب ہیں سلف صالحین کے علاوہ کچھ علماء ایسے بھی ہیں جو اللہ کے بارے میں علوِ حقیقی کا انکار کرتے ہیں۔ البتہ علوِ مرتبہ کو ثابت کرتے ہیں۔ لیکن ابنِ عربی کیا کہتا ہے۔

سُنیئے۔

ابنِ عربی کا قول اللہ کے اسماء حسنہ سے علی بھی ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب وہاں اللہ کے علاوہ کچھ نہیں تو وہ کس پر بُلند ہے۔ کیا وہ اپنی ذات پر بلند ہے۔ یا کس چیز سے بُلند ہے؟ جب کے وہاں اس کے علاوہ کوئی اور نہیں اور وہ وجود کے لحاظ سے موجودات کا عین ہے۔

البتہ محدثات چیزیں اپنی ذات کے لحاظ سے بُلند ہیں۔ اور محدثات بھی تو خدا ہیں۔ پس اگر وہ بلند ہے تو یہ بلندی اضافات کے قبیل سے نہیں ہے۔ اس لیے کہ معدوم اشیاء میں وجود کا اشارہ تک بھی موجود نہیں ہوتا۔ پس موجودات تمام کی تمام ایک ہیں۔ اور یہ سب چیزیں عین خدا ہیں۔ البتہ ان چیزوں میں تفاضل موجود ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں۔ وُہ وُہ نہیں تُو تُو نہیں یعنی وہ تو ہے۔ اور تو وُہ ہے۔ چُنانچہ خرّاز کہتا ہے کہ اس کا چہرہ خدا کا چہرہ ہے۔ اور اس کی زبان خدائی زبان ہے۔ اور خدا کی ذات اپنے بارے میں متضاد چیزوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اوّل بھی وہ ہے آخر بھی وہ ہے۔ ظاہر بھی وہ ہے۔ باطن بھی وہ ہے۔ اور اس کے علاوہ کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ وہی خدا ہے جس کا نام ابوسعید خرّاز ہے۔ ص۷۷،۷۶

ابنِ عربی کا ردّ غور کیجئے کہ ابنِ عربی کس قدر بے باکی کے ساتھ اللہ کے اس نام پر استہزاء کر رہا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ اللہ کس پر بُلند ہے۔ اور کس سے بُلند ہے اور اس کے علاوہ تو کسی کا وجود نہیں۔ وہی محدث ہے۔ وہی ابوسعید خرّاز ہے۔ حالانکہ ابوسعید خرّاز کا تیسری صدی ہجری کے آئمہ میں شمار ہوتا ہے۔ پھر اس پر نظر ڈالیے کہ وہ کہتا ہے کہ بعض محدث چیزیں بعض پر بلند ہیں۔ اور تعجب ہے کہ یہ بھی کہتا ہے کہ تمام محدثات خدا ہیں۔

لہٰذا! اللہ میں علو کی صفت ہے۔ لیکن اضافی نہیں۔ اس لیے کہ کائنات میں اللہ کا غیر موجود نہیں ہے۔ ان کے ہاں اللہ کے بُلند ہونے کا صرف یہ مطلب ہے کہ اللہ صرف اپنی ذات کے لحاظ سے بُلند ہے۔ پھر ابن عربی اسی پر

نہیں رُکتا بلکہ جو قبیح چیزیں ظلم۔ برائی۔ ناحق خون گرانا ان تمام برائیوں کو اللہ کی طرف نسبت کرتا ہے۔ بلکہ ان برائیوں کو بھی خدا قرار دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

ابنِ عربی کا قول اللہ کے فی ذاتہٖ بلند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو ایسا کمال حاصل ہے۔ جو تمام موجودات پر حاوی ہے۔ یعنی کوئی وصف اس سے فائق نہیں ہے۔ عرفاً۔ عقلاً۔ شرعاً جو چیزیں محمود ہیں یا مذموم ہیں۔ وہ تمام کی تمام اللہ کے مسمّٰی کا عکس ہیں۔ یعنی وہ سب خدا ہیں۔ کیا اس کفر سے بڑا کفر تصوّر میں آسکتا ہے۔ اور کیا اس سے زیادہ گستاخی بے ادبی بے حیائی اللہ کی ذات میں روا رکھی جاسکتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ اے اللہ پاک ہم پر تو اپنی رحمت نازل فرما۔ اور ان لوگوں پر اپنا عذاب نازل فرما۔ (العذہم اللہ)

اس قسم کی باتیں تکرار کے ساتھ اس کی کتابوں میں موجود ہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے تمام کائنات اور محدثات اللہ کا مظہر ہیں اور اللہ میں محدثات کے اوصاف موجود ہیں۔ اسی طرح اس میں عیب اور نقص کے وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ (ص ۸۰) مزید وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ جس مینڈھے کو اللہ پاک نے حضرت اسماعیل کے فدیہ میں اتارا تھا وہ مینڈھا بھی خدا تھا۔ تعالی اللہ عن ذالک علواً کبیرا۔

ابنِ عربی کا شعر ملاحظہ کریں۔

فیا لیت شعری کیف ناب بذاتہٖ شخیص کبیش عن خلیفۃ رحمان	کاش مجھے علم ہو جائے کہ پیارے مینڈھے کے وجود نے کس طرح اللہ کے خلیفہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔

نیز وہ کہتا ہے۔

فوقتا یکون العبد ربا بلا شک
ووقتا یکون العبد عبدا بلا افک
فان کان عبدا کان بالحق واسعا
وان کان ربا کان فی عیشۃ ضنک
(الفصوص ص ۹۰)

اس میں کچھ شک اور جھوٹ نہیں کہ کبھی بندہ رب بن جاتا ہے اور کبھی بندہ بندہ رہتا ہے۔ جب وہ بندہ ہوتا ہے تو خدا ہونے کی وجہ سے اس میں وسعتیں ہوتی ہیں اور اگر وہ رب ہوتا ہے تو بندہ ہونے کے لحاظ سے وہ تنگ داماں ہوتا ہے۔

اسی پر اکتفار نہیں بلکہ وہ کہتا ہے کہ خدا کا کامل ظہور اور اسکی پوری معرفت عورت کے وجود میں ہے۔ جب انسان اس سے ہمکنار ہوتا ہے شہوت رانی کرتا ہے۔ لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس قسم کی شہوت کو مشتعل کرنے والی باتیں جن کے قبیح ہونے میں کچھ کلام نہیں اس قسم کی لچر باتیں اس کی کتابوں میں جا بجا موجود ہیں۔

خدا کی قسم اگر اس کے ان باطل نظریات سے آگاہ کرنا فرض نہ ہوتا اور اُمت مسلمہ کو ان باتوں سے ڈرانا نہ ہوتا۔ تو میں کبھی اس قسم کی حیا باختہ شرم انگیز شہوت کو مشتعل کرنے والی باتوں کو تحریر میں نہ لاتا۔ لیکن کیا کیا جائے کہ معاشرہ میں ایسے لوگ دندناتے پھر رہے ہیں۔ جو ان باطل نظریات کا پرچار کرتے ہیں۔ اور ان کی طرف سے مدافعانہ جنگیں لڑتے ہیں، بلکہ اس شخص کو مقام ولایت سے ہمکنار کیا جاتا ہے۔ جو ان مذموم اور قبیح نظریات کا قائل ہے۔

مزید براں! جو لوگ ان سے تعرض کرتے ہیں اور ان کے خلاف حقیقت کا اظہار کرتے ہیں۔ انہیں کافر، زنادیق، بد دین کہا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں ان لوگوں نے اس قسم کے دینی مراکز قائم کر رکھے ہیں۔ اور عوام کالانعام ان کے پیروکار ہیں۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سوچ کے کواڑ بند ہو چکے ہیں۔ اور ان کے ہاں نیکی اور بُرائی میں کچھ تمیز نہیں ہے۔ ابن عربی اور حدیث: حبب الی من دنیا کم النساء والطیب

الطیب والنساء کی تشریح

ابن عربی جو صوفیاء کے سرخیل سمجھے جاتے ہیں اور آج کے دن تک انہیں شیخ الصوفیاء کے لقب سے پکارا جاتا ہے وہ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں سُنیئے۔

اللہ پاک نے انسان سے ایک دوسرے وجود کو اسی شکل پر نکالا اور اس کا نام عورت رکھا۔ یوں سمجھیئے کہ عورت آدمی کا ظہور ہے۔ جب آدمی عورت کی جانب جھکتا ہے۔ اور اشتیاق اختیار کرتا ہے۔ تو گویا اپنے نفس کی طرف شوق کر رہا ہے۔ اور عورت جب آدمی کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ اور کشش محسوس کر رہی ہے۔ جس طرح ایک مسافر اپنے وطن کی کشش رکھتا ہے۔ اسی طرح عورت بھی اپنے وطن یعنی آدمی کی طرف شوق کر رہی ہے۔ اس لحاظ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتیں محبوب تھیں۔ اور اللہ کی محبت جس مخلوق کے ساتھ زیادہ تھی۔ اللہ نے اس مخلوق کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا۔ اور اس کے بارہ میں فرشتوں سے کہا کہ تم اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ۔ حالانکہ فرشتے بہت بڑی قدر و منزلت کے مالک ہیں۔ یہ بنیادی نکتہ ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اور انسانوں کے درمیان کس قدر مناسبت ہے۔ اور شکل و صورت کے لحاظ سے کس قدر ہم آہنگی ہے۔ ص ۲۱۶

ابنِ عربی کا رد ابنِ عربی نے انسان کو عورت کا اصل قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ انسان عورت کے ساتھ اس لیے محبّت کرتا ہے۔ کہ عورت اس کے وجود کا ایک جزء ہے۔ ہمیں بھی اس سے انکار نہیں اگر کسی اچھے انداز میں یہ بات کہی جائے تو یہ بات درست ہے لیکن ابنِ عربی اس کو بنیاد قرار دیتے ہوئے کہتا کہ اللہ پاک کی محبت انسان سے اس لیے ہے کہ اللہ نے اسے اپنی صورت پر پیدا فرمایا۔ یعنی انسان نے رحمان کی شکل دھار لی ہے۔ اور اس کا وجود خدا کا ظہور ہے۔ تعالیٰ اللہ عن ذالک علوا کبیرا۔

ابنِ عربی یہاں اللہ کو مخلوق کے ساتھ مشابہ قرار دیتا ہے۔ اس کا یہ نظریہ وحدۃ الوجود کے نظریہ کے مخالف ہے۔ اور اس خیال سے بھی کہ تمام موجودات خدا کی صورت ہیں۔ اور کسی ایک صورت کے بارے میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ مثال کے طور پر وہ اللہ کی تصویر ہے۔ بلکہ تمام صورتوں کا وجود اللہ کا وجود ہے۔ معلوم ہوا کہ ابنِ عربی کے کلام میں نہ صرف یہ کہ تناقض موجود ہے بلکہ مکاری اور خُبثِ وطن کی کرشمہ سازیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اور انسان سے محبت کا سبب یہ قرار دیتا ہے کہ چونکہ اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ اس لیے اللہ انسان سے محبت کرتا ہے۔ اس کی عبارت کو بار بار پڑھنے سے حقیقت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔

مزید اپنے باطل نظریات کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ عورت بھی مرد کی ہمشکل ہے۔ یعنی عورت نے اللہ کے وجود کو جوڑا بنا دیا جیسا کہ عورت آدمی کے ساتھ مل کر جوڑے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پس تین چیزوں کا ظہور ہوا۔

ایک خدا، دوسرا مرد تیسری عورت، پس آدمی کو اپنے رب کی اسی طرح کشش ہوتی ہے جیسے طرح عورت کی ہوتی ہے۔ پروردگار نے آدمی کو عورت کی محبت میں مبتلا کر دیا۔ جیسا کہ اس نے انسان سے محبت کی جو کہ اللہ کی شکل پر ہے۔ چونکہ انسان کو اللہ نے بنایا۔ اس لیے انسان کی محبت خدا سے ہے۔ اسی لیے لفظ حبب صیغہ مجہول استعمال کیا ہے صیغہ معلوم احببت استعمال نہیں ہوا۔ کیونکہ انسان کی محبت اس کے رب کے ساتھ ہے جو انسان کی صورت پر ہے۔ اسی طرح ۔ جس طرح آدمی کی محبت اس کی عورت کے ساتھ ہے۔ کیونکہ آدمی عورت سے اس لیے محبت کرتا ہے۔ کہ اللہ بھی انسان سے محبت کرتا ہے گویا کہ اللہ کے اوصاف کو اختیار کیا گیا ہے۔

خیال کیجئے کس قدر دجل اور فریب ہے۔ اور کتنی بڑی دیدہ دلیری ہے۔ اور کتنی بڑی حیا سوزی کی بات ہے۔ کہ آدمی کے کسی عورت کے ساتھ محبت بھرے اخلاق کو تخلق باخلاق اللہ کی منزل قرار دیا جا رہا ہے۔ تعالی اللہ عن ذالک علواً کبیرا۔
چونکہ ابن عربی کا موقف یہ ہے کہ اللہ آدم کا اصل ہے۔

اس لیے اس کی کتابوں میں ایسی عبارات موجود ہیں جن کا مطالعہ کرنے سے ندامت سے سر جھک جاتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ جب آدمی عورت سے محبت کرتا ہے۔ تو وہ اس جستجو میں رہتا ہے کہ وہ کونسا بہترین ذریعہ ہے جس سے محبت میں اضافہ ہو۔ تو اسے نکاح سے کوئی بڑا ذریعہ معلوم نہیں ہوتا۔ چونکہ اس محبت میں شہوت کی وسعتیں آدمی عورت کے تمام اعضاء وغیرہ پر حاوی ہوتی ہیں۔ اسی لیے حکم دیا گیا کہ اس کے بعد غسل کیا جائے یعنی تمام جسم کا غسل کرنا ضروری ہو گیا۔ اس لیے کہ شہوت بھی پورے انسانی ڈھانچے میں موجود تھی۔

لیکن اللہ کی غیرت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ پختگی کے ساتھ اس بات کا معتقد ہو۔ کہ تمام لذتیں اور شادمانیاں صرف اللہ کے ساتھ ہیں۔ اب جب کہ وہ اللہ کے غیر کے ساتھ لذت حاصل کرتا ہے۔ تو اس کی پاکیزگی کے لیے ضروری ہے کہ غسل کرے تاکہ دوبارہ اسے اللہ کے ساتھ تعلق حاصل ہو جائے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ جب وہ عورت سے مجادرت کرتا ہے۔ تو عورت میں خدا کا مشاہدہ کرتا ہے یعنی عورت جو کہ منفعل ہے۔ اس میں فاعل کو خدا نظر آ رہا ہے۔ اور جب فاعل اپنے آپ میں خدا کا مشاہدہ کرے تو اس صورت میں اس نے فاعل میں خدا کا مشاہدہ کیا۔ ہاں اگر کسی دوسری صورت کے استحضار کے بغیر اپنے آپ میں وہ خدا کا مشاہدہ کرتا ہے۔ تو اس صورت میں منفعل میں خدا کا ظہور بلا واسطہ ہو گا۔

پس عورت میں خدا کا مشاہدہ اس لیے اکمل ہے۔ کہ اس صورت میں فاعل اور منفعل دونوں صورتوں میں خدا کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اگر صرف اپنے نفس کا مشاہدہ کرے گا۔ تو یہ صورت اکمل نہیں ہے۔ اسی لیے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے زیادہ محبت کرتے تھے۔ جب کہ ان میں اللہ کا مشاہدہ کامل طور پر ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ کبھی بھی مادیات سے ہٹ کر خدا کا مشاہدہ تجریدی صورت میں نہیں ہو سکتا۔ ص ۲۱۷ فصوص الحکم

میں سمجھتا ہوں کہ اس کلام کے بعد مزید کچھ گنجائش نہیں اتنا بیان کرنا ہی کافی ہے۔ پس وہ مسلمان جس کو اللہ پاک نے اس قسم کی اخلاقی گراوٹ و سفلہ پن اور طبعی عقلی برائیوں سے محفوظ رکھا ہے۔ اس کے لیے اپنے ایمان کو مضبوط کرنے کے لیے ضروری ہے۔ کہ وہ یہ دعا پڑھے۔

یا مقلب القلوب ثبت قلوبنا علی دینک

اے دلوں کو پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنے دین پر ثابت فرما۔

ابن عربی اسی معنی کی تشریح کرتے ہوئے مزید کہتا ہے کہ جس قدر عورتوں میں حق کا مشاہدہ ہے۔ اس قدر کائنات کی کسی دوسری چیز میں نہیں ہے۔ اس لحاظ سے جو شخص عورتوں سے محبت کرتا ہے۔ وہ خدا سے محبت کرتا ہے۔ چنانچہ اسی مضمون کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے۔

اصح عند الناس انی عاشق غیر ان لم یعرفوا عشقی لمن؟	یہ بات لوگوں کو معلوم ہے کہ میں عاشق ہوں لیکن وہ اس سے بے خبر ہیں کہ میرا عشق کس کے ساتھ ہے۔ الفصوص ص ۲۱۸

کتبہ افتخار احمد گکھڑ منڈی ضلع گوجرانوالہ

اے شفقت
عثمان

افکارِ صوفیہ

کتاب و سنّت کی روشنی میں

مؤلّفہ

الشیخ عبد الرحمٰن عبد الخالق حفظہ اللہ

ترجمہ

محمد صادق خلیل

الناشر

حبیب الرحمٰن جاوید منیجر ضیاء السنۃ ادارۃ الترجمہ والتالیف

رحمت آباد۔ فیصل آباد (الباکستان)